سید الانبیاءؐ

(ٹامس کارلائل کی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کے دوسرے لیکچر کا ترجمہ)

پروفیسر محمد اعظم

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

لاہور - راولپنڈی - ملتان - کراچی - سکھر - پشاور - کوئٹہ

سیدالانبیاءؐ

(ٹامس کارلائل کی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کے دوسرے لکچر کا ترجمہ)

پروفیسر محمد اعظم

نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد
لاہور - راولپنڈی - ملتان - کراچی - سکھر - پشاور - کوئٹہ

طبع اوّل : ۱۹۷۶ء : دو ہزار

طبع دوم : ۱۹۸۳ء : دو ہزار

طبع سوم : ۱۹۸۷ء : دو ہزار

طبع چہارم : ۱۹۹۲ء : ایک ہزار

طبع پنجم : ۱۹۹۵ء : ایک ہزار

کوڈ نمبر : جی بی آر پی / پی ۵۶۶/۱،۰۰۰

مطبع : منزہ پرنٹنگ کارپوریشن اسلام آباد

قیمت : 20 روپے

ناشر : نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد

نذر

بہ بارگاہ رسالت پناہ روحی فداک ﷺ

اے کہ در مدحت نہ تنہا دوستاں رطب اللساں
دشمناں ہم پیش پائے تو سپر انداختند

(اعظم)

Mount Pleasant Road,
Malabar Hill,
BOMBAY, 26th August, 1944

Dear Sir,

I am in receipt of your letter of August 17th, and I am glad to send you the following few words, as desired by you, in the shape of a Foreword from me:-

I am very glad indeed that you are bringing out a second edition of the Urdu Translation of Carlyle's "Heroes & Hero Worship". Amongst the various works of Carlyle I read this one in English when I was a student in England, and ever since I have held the Sage of Chelsea in great admiration. He has done a great service not only to the Mussalmans but to the rest of the world in giving an impartial picture and the history of the life and career of our great Prophet, and your venture to have a second edition of the Urdu translation is welcome, and I wish you every success.

I have received the Urdu translation you have sent to me, and I thank you for it.

Yours faithfully,

M A Jinnah

Mohamed Azam, Esq.,
Lecturer, Urdu Department,
Osmania University,
Hyderabad, Deccan.

ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ

مالابارہل۔ بمبئی

مورخہ ۲۶ راگست ۱۹۴۴ء

جناب من!

آپ کا مکتوب مورخہ ۱۷ راگست موصول ہوا اور میں بڑی مسرت کے ساتھ آپ کے حسب خواہش مندرجۂ ذیل چند سطور بطور پیش لفظ آپ کو ارسال کر رہا ہوں:

مجھے درحقیقت بڑی مسرت ہے کہ آپ کارلائل کی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کے اردو ترجمے کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں جس زمانے میں میں انگلستان میں زیر تعلیم تھا، میں نے کارلائل کی متعدد دیگر تصانیف کے منجملہ اس کتاب کا بھی انگریزی میں مطالعہ کیا تھا اور اسی وقت سے میرے دل میں "چیلسی کے اس عظیم دانشور" کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ اس نے ہمارے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی حیات طیبہ اور آپؐ کے کارناموں کی سچی تصویر پیش کر کے نہ صرف عالم اسلام بلکہ ساری دنیا کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

اس کتاب کے اردو ترجمے کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کا آپ نے جو تہیہ کیا ہے وہ نہایت مستحسن ہے اور میں آپ کی کامیابی کا متمنّی ہوں۔

آپ نے اس کے اردو ترجمے کا جو نسخہ ارسال کیا ہے وہ مجھے مل گیا اور اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص

ایم، اے، جناح

بخدمت جناب محمد اعظم صاحب

لکچرار شعبۂ اردو۔ جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد دکن

مقدمہ

قاعدے کی بات ہے کہ جب انسان کا بس زور و قوت سے نہیں چلتا تو وہ مکر و فریب سے کام لیتا ہے۔ مکر و فریب اور کذب و افترا دراصل کمزوری کی علامت اور شکست کا اعتراف ہے۔ تاریخِ عالم کے اوراق اس انسانی کمزوری کی مثالوں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں سے صرف ایک واقعہ کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

ساتویں صدی عیسوی میں بادیہ نشینانِ عرب کی بیداری، تاریخِ ارتقا کا وہ حیرت انگیز واقعہ ہے جس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ اس واقعہ سے جہاں ان خانہ بدوش قبائل کی عظیم الشان ترقی کا پتہ چلتا ہے، وہیں ان کی ہمسایہ قوموں کی وہ افسوسناک کمزوری بھی ظاہر ہوتی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ چنانچہ جب مسیحی بادشاہوں اور مقتداؤں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا بڑھتا ہوا سیلاب ان کے ملک و مذہب کو خس و خاشاک کی طرح

بہالے جا رہا ہے، جس کے مقابلے میں ان کے افواج و عساکر اور دلائل و براہین سب بیکار ہوئے جاتے ہیں تو انھوں نے اسی کذب و افترا کے حربے سے کام لینا شروع کیا اور عوام کے دلوں میں تعصب و عداوت کا ایسا بیج بویا جو صدیوں تک نشوونما پاتا رہا۔ اگرچہ اب ایک عرصے سے اس شجرِ تعصب میں پت جھڑ شروع ہوگئی ہے اور آج مارگولیتھ کی طرح کے دو چار سے زیادہ ثمر اس پر نہیں نظر آتے لیکن آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے جس زمانے میں کارلائل نے یہ لکچر دیا ہے وہ اس درخت کی بہار کا موسم تھا جب کہ اس کی ہر شاخ پر ڈاکٹر وائٹ اور ڈاکٹر مولر کی طرح کے بہت سے حنظل موجود تھے۔ اس زمانے میں اسلام وہ قہر آسمانی بتایا جاتا تھا جو مسیحیت کو نیست و نابود کرنے کے لئے نازل ہوا ہو۔ کارلائل کے سامنے اسلام کے متعلق جو کچھ مواد تھا وہ زیادہ تر اسی قسم کا تھا کہ "محمدؐ لوگوں کو اپنے طلائی بُت کی پرستش کی دعوت دیتا ہے مسلمانوں کا دیوتا "اپلین" وہاں ایک غار میں تھا۔ مسلمانوں کے دوسرے دیوتا "ماہوم" کو انھوں نے ایک گڑھے میں ڈال دیا جسے سور اور کتوں نے نوچ ڈالا۔"[1]

ایسے عہد میں جب کہ تعصب کی گھٹا ہر طرف چھا رہی ہو اور

---

[1] سیرت النبیؐ از شبلی

عداوت کی آگ ہر سینے میں بھڑک رہی ہو، آفتابِ صداقت کو دیکھنا نہایت مشکل کام ہے، اور دکھانا مشکل تر۔ یہ صرف اس شخص سے ممکن ہے جو کارلائل کی طرح چشمِ بینا اور ہمت مردانہ رکھتا ہو۔ چنانچہ جس جرأت سے وہ اس طلسم باطل کو توڑتا ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ وہ کہتا ہے:

"محمدؐ کے متعلق ہمارا یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے کہ وہ دغاباز اور کذب مجسم تھے اور ان کا مذہب محض فریب و نادانی کا ایک مجموعہ ہے۔ کذب وافترا کا وہ انبار عظیم جو ہم نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس ہستی کے خلاف کھڑا کیا خود ہمارے لئے شرمناک ہے.... اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ آج بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ انسانوں کے حق میں شمع ہدایت کا کام دے رہے ہیں.... کیا ہم کسی طرح اسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ سب روحانی بازیگری کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا جس پر اتنے بندگانِ خدا ایمان لائے اور گزر گئے؟.... افسوس! ایسے نظریئے سخت افسوسناک ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر ملحدانہ نظریہ اس دنیا میں آج تک نہ قائم کیا گیا ہوگا۔ ایک جھوٹا آدمی اور کسی مذہب کا بانی ہو! جھوٹا آدمی اینٹ اور چونے کا ایک مکان تو بنا نہیں سکتا۔ اگر کسی شخص کو ان اشیاء کے خواص کا صحیح علم نہ ہو جو تعمیر مکان میں کام آتے ہیں تو اس کا بنایا ہوا مکان، مکان نہ کہلا سکے گا بلکہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا۔ ایسا مکان بارہ صدی تک قائم نہیں رہ سکتا اور نہ اس میں اٹھارہ کروڑ

انسان سما سکتے ہیں۔''

ایک اور جگہ آنحضرتؐ کے متعلق وہ اس طرح گہرافشانی کرتا ہے۔

''ہم کسی طرح حضرت محمدؐ کو حریص و منصوبہ باز اور اُن کی تعلیمات کو جہل
نادانی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اُمیانہ پیغام جو آپ لے کر آئے تھے، بالکل سچا تھا
وہ ایک آوازِ پریشاں تھی جو پردۂ غیب سے بلند ہوئی۔ اُس شخص کے نہ اقوال
جھوٹے تھے نہ افعال۔ اس میں تنگ ظرفی اور نمائش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ
زندگی کا ایک جلوۂ تاباں تھا جو خاص سینۂ فطرت سے ہویدا ہوا اور جسے
خالقِ عالم نے کائنات کو منور کرنے کے لئے بھیجا۔''

اس طرح کے اور بہت سے مقامات اس لکچر میں ایسے ہیں جن سے
کارلائل کے فوق العادۃ جوش اور غیر معمولی جرأت کا پتہ چلتا ہے اور جن
پر نظر کرتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ مذہب عیسوی کی تاریخ
میں وہ پہلا شخص تھا جس نے نیک نیتی کے ساتھ اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے
کی کوشش کی۔

اس میں شبہ نہیں کہ آئندہ صفحات میں ہمیں بعض خیالات ایسے بھی ملتے
ہیں جو اس لکچر کی عام اسپرٹ سے مناسبت نہیں رکھتے۔ ایسے مقامات
دو حصّوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جہاں مقرر نے صداقت
کی روح کو پا تو لیا ہے لیکن اس کے بے باکانہ اظہار میں مصلحت مانع آتی

ہے اور سامعین کے جذبات کا پاس دامنگیر ہوتا ہے۔ مثلاً شروع ہی میں کارلائل کہتا ہے کہ "ہم نے محمدؐ کا انتخاب اس لئے نہیں کیا کہ وہ افضل ترین پیغمبر ہیں"۔ حالانکہ ہیروز کے اس سلسلے کے لئے آپؐ کا انتخاب خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ آپؐ کو افضل ترین پیغمبر سمجھتا تھا لیکن مصلحت وقت اجازت نہیں دیتی تھی کہ مسیح پر محمدؐ کو ترجیح دی جائے اور پھر اس کی کوئی تاویل نہ کی جائے۔ اسی طرح شروع میں وہ فقط سامعین کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے کہتا ہے کہ "چونکہ ہم میں سے کسی کے مسلمان ہو جانے کا اندیشہ نہیں، اس لئے میں محمدؐ کے وہ تمام اوصاف بیان کر دینا چاہتا ہوں جو انصاف کے ساتھ ممکن ہیں"۔ حالانکہ جب وہ اپنی جادو بیانی کے زور سے سامعین کی ذہنیت کو پوری طرح مسخر کر لیتا ہے تو خاتمہ کے قریب پہنچ کر انہی مسلمانوں کے متعلق اس طرح اظہار خیال کرتا ہے: "ازمنہ اولیٰ کے بعد آج تک عیسائیوں کا کوئی فرقہ اپنے مذہب کا ایسا پابند نہیں رہا جیسے کہ مسلمان اپنے مذہب کے۔ وہ اس پر کامل یقین رکھتے ہیں اور اسی پر اپنی دنیا و آخرت کا دارو مدار سمجھتے ہیں۔ "اللہ اکبر" اور "اسلام" کے الفاظ ان بے شمار بندگانِ خدا کے رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں اور ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئے ہیں"۔ ان مثالوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کارلائل نے مصلحت کی خاطر صداقت کا خون کر دیا اور کلمۂ حق

کے ظاہر کرنے میں کما حقہ، جرأت سے کام نہیں لیا۔ نہیں! بلکہ یہ فن
خطابت کے وہ اہم گر ہیں جن سے کوئی تجربہ کار اور فطرت شناس مقر
قطع نظر نہیں کرسکتا۔ سامعین کے ایک مختلف الخیال مجمع کو اپنا
ہمنوا بنانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے پہل اُن کے جذبات کی بھی تھوڑی
سی رعایت کی جائے۔

البتہ اس لکچر کے بعض اجزا ایسے ضرور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے
کہ مواد کی قلّت اور ماحول کی ظلمت کے باعث فی الحقیقت مقرر
بعض اسلامی اصولوں کو پوری طرح جذب نہیں کرسکا۔ لیکن اس کے
باوجود ہمیں اس کی نیت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی
کیونکہ اگر وہ کہیں عیسائیوں کے کسی اعتراض کو دہراتا اور اس کی تائید
کرتا ہے تو اس کے بعد خود ہی اس کا جواب دینے اور اس کی تاویل کرنے
سے بھی گریز نہیں کرتا۔ مثلاً اگر ایک جگہ قرآن کو وہ بے ربط اور پیچیدہ کہتا
ہے تو دوسری جگہ خود ہی اس کے متعلق یہ بھی کہتا ہے کہ "قرآن کے ان
بے ربط روایات، الزامات، شکایات اور وظائف میں اصلی اور حقیقی
بصیرت کی ایک ایسی جھلک نظر آتی ہے جسے شاعرانہ لطافت سے تعبیر
کرنا بے جا نہ ہوگا"۔ اسی طرح اگر وہ ایک جگہ یہ کہتا ہے کہ "اسلام میں
بہشت و دوزخ کا جو تصور پیش کیا گیا وہ بڑی حد تک حیوانی ہے جس

سے ہمارے روحانی احساسات سخت مجروح ہوتے ہیں" تو آگے چل کر خود اس کا جواب اس طرح دیتا ہے کہ "بہشت اور دوزخ کا اسلامی تصور خواہ کیسا ہی بھدا اور مادی سہی لیکن ایک حقیقت جاوید کی ایسی زندہ تصویر ہے، جس کی مثال کسی اور جگہ نہیں ملتی"۔

غرض جہاں کہیں اس نے اسلام پر خود کوئی اعتراض کیا ہے یا اور عیسائی معترضین کی تائید کی ہے، وہیں ان اعتراضوں کا جواب دینے اور انھیں رفع کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ چونکہ یہ اعتراضات اس لکچر کے اہم اجزا میں سے ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان پر ذرا تفصیل سے نظر ڈالی جائے۔

اس سلسلے میں ہماری نظر سب سے پہلے ان خیالات پر پڑتی ہے جو کارلائل نے قرآن کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن کے مطالب کو ہر شخص آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ جب ایک معمولی گوشت پوست رکھنے والے انسان کا کلام سمجھنے کے لئے ہمیں متعدد شروح و حواشی کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے باوجود بعض دفعہ اس کے اصلی معنی کا تعین نہیں ہو سکتا اور اس کی مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ تو اس کلام کو بدرجہ اولیٰ مشکل ہونا چاہیئے جو خالق کونین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق دنیا کی ایک کثیر آبادی

صدق دل سے یہ یقین رکھتی ہے کہ وہ اسی نورِ مجرّد کا ایک مرئی اور محسوس
مظہر ہے جس کے پرتوِ رخ سے تمام انبیاء کے دل منور ہوتے رہتے ہیں۔
بیچارے سیل کی کیا بساط کہ اس کا ترجمہ کرتا۔ جس چیز کو وہ خود نہیں سمجھ
سکا اسے دوسروں پر کیا منکشف کرسکتا تھا۔ اس لئے اگر اس کا ترجمہ
قرآن پڑھ کر کارلائل نے اسے "بے ربط"، کہدیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں
اس موقع پر ہم چند ایسی مثالیں پیش کرنا چاہتے تھے جن میں بعض مفسرین
نے یہ ثابت کیا ہے کہ کلام مجید کی اکثر آیتیں جو بظاہر بالکل بے ربط اور
غیر متعلق معلوم ہوتی ہیں، کس طرح ایک ہی رشتۂ معنی میں منسلک ہیں
لیکن یہ ایسا وسیع موضوع ہے جو یہاں خاطر خواہ پھیلایا نہیں جاسکتا،
اس لئے اس بحث کو نظر انداز کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا مقام وہ ہے جہاں اس امر کے متعلق بحث کی گئی ہے کہ
"بہشت و دوزخ کا اسلامی تصور بڑی حد تک حیوانی ہے"۔ اگرچہ
عیسائیوں کے اس اعتراض کے کئی جواب خود کارلائل نے دیئے ہیں لیکن
ان میں سے بعض چنداں تسلی بخش نہیں معلوم ہوتے۔ اس موقع پر یہ
دلچسپ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مکافاتِ عمل سے کیا مراد؟ اس سے
کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کے ہر فعل کی کچھ نہ کچھ سزا یا جزا ہو
ہے۔ یہ سزا اور جزا کیا چیز ہے؟ جزا نام ہے اس نتیجۂ اعمال کا جو انسان کی

مرضی کے مطابق ہو اور سزا جو اس کی مرضی کے خلاف۔ وہ سزا سزا ہی نہیں جو بدکار کو خوش کردے اور وہ جزا جزا ہی نہیں جو نکوکار کو ناراض۔ اب دیکھئے کہ فطرتِ انسانی کیا چاہتی ہے؟ اعلیٰ غذائیں، لطیف خوشبوئیں، حسین صورتیں، دلکش آوازیں۔ غرض وہ تمام چیزیں جو اُس کے حواسِ خمسہ کو فرحت و لذت بخشیں اور ان کی نشو و نما میں ممد و معاون ہوں۔ اس کے برخلاف ایسی تمام چیزوں سے فطرت ابا کرتی ہے جو ان حواس کو اذیت پہنچائیں اور مضمحل کردیں۔ بس اسی چیز کا قرآن میں لحاظ رکھا گیا اور یہی بہشت و دوزخ کا اسلامی تصور ہے۔ صرف اس لئے کہ جنت کی تعریف میں حور و غلماں اور کوثر و تسنیم کا ذکر کیا گیا یہ کہنا کہ وہ حیوانی ہوگئی دراصل فطرت انسانی کو رسوا کرنا اور اس کے بنانے والے پر معترض ہونا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انسان میں جسمانی خواہشات سے اعلیٰ تر ایک جذبہ روحانی کیف و سرور کا موجود ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے جسمانی مطالبات کی تکمیل نہ کی جائے۔ چنانچہ جنت میں جسمانی خواہشات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ روحانی مطالبات کی تکمیل کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ خود کارلائل کہتا ہے۔ "وہ جنت کی اعلیٰ ترین نعمت روحانی ہوگی یعنی خدا کا دیدار جو باقی تمام نعمتوں سے بدرجہا

افضل ہوگا۔"

یہی حال دوزخ کا ہے "جحیم و غساق" اور "ناروز قوم" یہ سب کیا ہیں؟ انسانی مطالبات کی خلاف ورزیوں کے مختلف نام ہیں اور بس۔

عیسائیوں کا تیسرا اعتراض جو اس لکچر میں ظاہر کیا گیا، اسلام کے بزور شمشیر پھیلنے کے متعلق ہے۔ کارلائل نے اس کے جواب میں جو کچھ بحث کی وہ اگرچہ نہایت دلچسپ اور فلسفیانہ ہے لیکن اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اس نے اس اعتراض کو ایک حد تک تسلیم کر لیا ہے، حالانکہ یہ اعتراض اس قدر بے بنیاد ہے کہ صفحات تاریخ سے اس کی کہیں تائید نہیں ہوتی۔ پروفیسر آرنلڈ آنجہانی نے اپنی بیش بہا تاریخ "دعوتِ اسلام" میں نہایت محنت کے ساتھ ان اسباب و علل پر روشنی ڈالی ہے جو مختلف اقطاعِ عالم میں اشاعتِ اسلام کا باعث ہوئے۔ اس میں انھوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ دکھلایا ہے کہ مذہب اسلام کی اشاعت کا اصلی ذریعہ صرف تعلیم و تلقین اور مسلمانوں کے صفات و محاسن تھے اور اگر کہیں تلوار استعمال ہوئی ہے تو اس کے اغراض زیادہ تر سیاسی رہے ہیں نہ کہ مذہبی۔

اس کے بعد ہم چوتھے اور آخری اعتراض کی طرف متوجہ ہوتے

ہیں جو اسلام کی ہوس پرستیوں سے متعلق ہے اور جس سے معترضین کی مراد غالباً تعدد ازدواج ہے۔ اس باب میں ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، قطع نظر ان جوابات کے جو خود کارلائل نے دیئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ تعدد ازدواج کا امتناع بلاکسی استثنا کے ایسی سخت غلطی ہے جسے ضروریات معاشرت کسی طرح جائز نہیں رکھ سکتیں جن قیود و شرائط کے ساتھ اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس سے کسی سمجھدار آدمی کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ مولوی چراغ علی (نواب اعظم یار جنگ مرحوم) نے اپنی کتاب "رسائل چراغ علی" میں اس مسئلے پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے اور صراحت کے ساتھ ان قیود کا ذکر کیا ہے جن کا نکاح ثانی کے وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ کسی مزید دلیل و حجت کا محتاج نہیں معلوم ہوتا۔

یہی چند مقامات اس لکچر میں ذرا کھٹکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ یہ لکچر آج سے ڈیڑھ سو سال قبل ایک ایسے مجمع میں دیا گیا تھا جہاں تمام کٹر عیسائی جمع تھے اور جن کے نزدیک اسلام کا نام لینا بھی کفر تھا تو پھر ہم کارلائل کی غیر معمولی اخلاقی جرأت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود کارلائل

اسی مذہب کا پیرو ہونے کے باوجود کس طرح جہل و تعصب کی تاریکیوں
میں منزلِ مقصود تک جا پہنچتا ہے اور کذب و افترا کے انبار سے حقیقت و
صداقت کے جواہر ریزے ڈھونڈ نکالتا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

تا نباشد سوزِ حق در سازِ فکر
نیست ممکن ایں چنیں اندازِ فکر

(اقبال)

محمد اعظم

کارلائل پر ایک مختصر نوٹ

انگلستان کا مایۂ ناز ادیب، مورخ اور فلسفی ٹامس کارلائل ۴ر دسمبر ۱۷۹۵ء کو جنوبی اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جیمز کارلائل پہلے ایک معمولی سنگ تراش تھا جس نے بعد میں کاشتکاری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ کارلائل نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے اور انن اسکول میں حاصل کی اور ۱۸۰۹ء میں اڈنبرا یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ یہاں اس نے ۱۸۱۳ء تک تعلیم پائی اور ڈگری حاصل کئے بغیر کالج چھوڑ دیا۔ اس کے بعد دو سال تک وہ مذہبی تعلیم پاتا رہا، لیکن اسے بھی نامکمل حالت میں چھوڑ کر ایک مدرسے میں ملازم ہو گیا تھا۔ تین سال وہ یہاں نائب مدرس کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ آخر اس سے تنگ آ کر استعفیٰ دے دیا اور اڈنبرا جا کر قانون

پڑھنے لگا۔ لیکن اس کی بے چین طبیعت کو اس میں بھی کچھ دلچسپی معلوم نہیں ہوئی اور آخر کار اسے چھوڑ کر اس نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا۔

کارلائل کی زندگی پچیس سال تک تلون مزاجیوں کا ایک مرقع رہی ہے جس سے بظاہر اس کے ارادوں کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے، لیکن نظر غور سے دیکھا جائے تو اسی تلون میں اس کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ فطرت ہر انسان میں کسی نہ کسی کام کی خاص صلاحیت ودیعت کرتی ہے۔ اگر وہ اُسی کی طرف متوجہ ہو اور اپنی فطری قابلیت کو بروئے کار لائے تو معراجِ کمال پر پہنچ سکتا ہے لیکن زمانہ ہر شخص کی مساعدت نہیں کرتا اور وقتی ضرورتیں اسے فطری رجحان کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کرتی ہیں یہی انسان کی آزمائش کا اصلی موقع ہے۔ اگر وہ سیلِ حوادث کی رو میں بہہ گیا تو ایک دن بحرِ گمنامی میں غرق ہو جاتا ہے۔ اور اگر اُن کا مقابلہ کر کے کامیاب ہو گیا تو آسمانِ شہرت پر چمک جاتا ہے۔

کارلائل کی تلوّن مزاجیوں میں اسی جدوجہد اور کشمکش کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ وقتی ضرورتوں سے مجبور ہو کر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتا ہے لیکن منزلِ مقصود سے دور نہیں ہونے پاتا کہ پھر اس کی طلب میں دوڑتا ہے۔ افسوس! کتنے کارلائل اس خاکِ پاک میں دفن ہوں گے جنھوں

نے وقتی فوائد اور عارضی منافع کی خاطر اس آوازِ فطرت کی طرف سے بے اعتنائی کی اور اس کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے آغوش گمنامی میں سلا دیئے گئے۔

۱۸۳۷ء میں کارلائل نے "انقلاب فرانس" کے نام سے وہ بیش بہا تاریخ لکھی جو پہلے پہل اس کی شہرت کا باعث ہوئی۔ ۱۸۴۰ء میں چند مشاہیر عالم پر وہ معرکتہ الآرا لکچر دیئے جو ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (مشاہیر اور مشاہیر پرستی) کے عنوان سے شائع ہوتے۔ اس کے بعد اس نے کرامول کے خطوط و خطبات اور فریڈرک اعظم کی سوانح عمری شائع کرائی جو اس کی آخری تصنیف ہے۔ کارلائل ان خوش نصیب اہل قلم میں ہے جن کی قدر ان کی زندگی ہی میں کی گئی۔ ۱۸۶۵ء میں وہ اڈنبرا یونیورسٹی کا لارڈ رکٹر بنایا گیا اور ۱۸۷۴ء میں اُسے "پرشین آرڈر آف کا مرٹ" کا اعزاز عطا ہوا۔ ایک عرصے تک ان عزت افزائیوں سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد وہ ۴ فروری ۱۸۸۱ء کو اس دارفانی سے چل بسا۔ کارلائل کا طرزِ تحریر نہایت دقیق اور پیچیدہ ہے۔ اس کا زورِ بیان، اس کا ذخیرۂ الفاظ، اس کا جوش و خروش اور اس کی پروازِ تخیّل اس بلا کی ہے کہ انگلستان جیسے مردم خیز خطّے میں بھی اس کا ثانی نہیں ملتا۔ وہ خیالات کا ایک بحرِ بے پایاں

ہے جس کی تحدید و تحصیر ممکن نہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کی تحریر کی خصوصیات گنانا اور اس کا مرتبۂ انشا پردازی دکھانا ہمارے امکان سے باہر ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی ادب میں کارلائل کو وہی رتبہ حاصل ہے جو فارسی میں ابوالفضل اور ظہوری کو یا عربی میں جاحظ اور حریری کو۔

مترجم

نوٹ: اس کتاب میں جتنے فٹ نوٹ دیئے گئے ہیں ان سب کا ذمہ دار مترجم ہے۔

دوسرا لکچر

ہیرو پیغمبر کی حیثیت سے

محمدؐ - اسلام

جاہلیت کے اُس ابتدائی زمانے سے جب کہ شمال میں اسکینڈے نیویا کے باشندوں پر شرک کی ظلمت طاری تھی، اب ہم ایک بالکل جداگانہ مذہبی دور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ان سے نہایت مختلف قوم پر گزر رہا تھا۔ یعنی عربوں پر اسلام کا عہد۔

اس طرح ہم انسان کے عالمگیر حالات اور خیالات میں ایک عظیم انقلاب اور ارتقا سے دوچار ہوتے ہیں۔

موجودہ ہیرو (محمدؐ) اپنے ابنائے جنس میں خدا نہیں مانا گیا[1]

---

[1] یہ اشارہ اس طرف ہے کہ اس سلسلے کے پہلے لکچر کا ہیرو (اوڈن) خدا مانا گیا تھا۔

بلکہ ایسا انسان سمجھا گیا جسے خدا کی طرف سے وحی ہوئی یعنی پیغمبر
مشاہیر پرستی کی یہ دوسری صورت ہے۔ پہلی یا سب سے
قدیم صورت اس طرح گزر گئی کہ اب اس کے واپس ہونے کی کوئی توقع
نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں پھر کوئی ایسا بڑا انسان نہ ہوگا جسے اس کے
بنی نوع خدا سمجھیں۔ یہ ایک غور طلب سوال ہے کہ کیا کسی قوم نے
کبھی فی الحقیقت ایسے شخص کو خدا مانا ہے جو اس کی نگاہوں کے
سامنے موجود تھا؟ غالباً اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ عموماً ایسے ہی
انسان خدا مانے گئے ہیں جن کو لوگوں نے کبھی دیکھا تھا یا جن کی صرف
یاد باقی رہ گئی تھی۔ لیکن آئندہ تو یہ کبھی نہ ہوگا۔ اب کوئی بڑا انسان
خدا نہیں مانا جاتا۔

کسی بڑے انسان کو خدا سمجھ لینا لوگوں کی نہایت فاش اور
ابلہانہ غلطی تھی۔ اس کے باوجود ہمیشہ یہ مشکل سوال رہا ہے کہ دراصل
اسے کیا سمجھنا چاہیئے اور کس طرح اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ کسی
عہد کی تاریخ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگوں نے
کسی جلیل القدر انسان کا استقبال کس طرح کیا۔ لوگوں کو ہمیشہ
ایسے انسان میں صفات ایزدی کا کچھ نہ کچھ پرتو نظر آتا ہے۔ یہ نہایت
اہم سوال ہے کہ لوگ ایسے شخص کو خدا سمجھتے ہیں یا پیغمبر یا کچھ اور! اس

کا جواب بمنزلہ ایک روزن کے ہے جس میں سے ہم ان لوگوں کی روحانی حالت کی تہہ تک دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ تمام بڑے انسان دستِ قدرت سے نکلتے وقت درحقیقت یکساں ہوتے ہیں۔ اوڈن[1]، لوتھر[2]، جانسن[3] اور برنس[4] میری رائے میں دراصل ایک ہی جوہر سے ہیں۔ لیکن جس طرح

---

[1] اوڈن قدیم توتانیوں (جرمن اسکینڈی نیویا اور اینگلوسیکسن اقوام کا مجموعہ ٹیوٹن کہلاتا ہے جس کا ترجمہ ہم نے توتانی کیا ہے) کا سب سے بڑا خدا مانا جاتا تھا۔

[2] مارٹن لوتھر جرمنی کا مشہور مذہبی مصلح اور فرقۂ پراٹسٹنٹ کا سب سے بڑا پیشوا تھا۔ وہ ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۶ء میں وفات پائی۔

[3] سیمول جانسن (ولادت ۱۷۰۹ء وفات ۱۷۸۴ء) انگریزی کا مشہور ادیب تھا جس نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی اور ۱۷۴۷ء میں انگریزی زبان کی نئی ڈکشنری ترتیب دی۔ اس کا ابتدائی زمانہ بہت عسرت میں گزرا لیکن ادبی خدمات کے صلے میں اُسے ۱۷۶۲ء میں تین سو پونڈ سالانہ کا شاہی وظیفہ عطا ہوا۔ اس کے ایک دوست بازول نے اُس کی سوانح عمری لکھی جسے انگریزی ادب میں بڑی شہرت حاصل ہے۔

[4] رابرٹ برنس (۱۷۵۹ء ۱۷۹۶ء) انگریزی زبان کا نہایت ممتاز شاعر تھا۔ یہ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ اس کے کلام کا پہلا مجموعہ ۱۷۸۶ء میں شائع ہوا۔ کثرت مے نوشی اور تعیش کی وجہ سے وہ کم عمری میں لقمۂ اجل ہو گیا۔

دنیا ان کا خیر مقدم کرتی ہے اور جو صورتیں وہ اختیار کرتے ہیں انہی کی وجہ سے ان میں بعد المشرقین ہو جاتا ہے۔ اوڈن کی پرستش ہم کو متحیر کر دیتی ہے۔ یعنی لوگوں کا فرط حیرت و محبت سے ایک بڑے انسان کو سجدہ کرنا اور تہہ دل سے یہ سمجھنا کہ وہ عرش کا مکیں یعنی خدا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان کی یہ تعظیم ناقص تھی۔ لیکن جس طرح ہم نے برنس جیسے انسان کا خیر مقدم کیا، کیا وہ کامل کہا جا سکتا ہے؟ انتہائی قیمتی تحفہ جو قدرت اس دنیا کو عطا کر سکتی ہے اور جسے ہم غیر معمولی انسان کہتے ہیں (ایک ایسی انسانی روح جو آسمان سے خدا کا پیغام دے کر ہمارے پاس بھیجی گئی) ہم اس کو معمولی اور مصنوعی آتش بازی کی طرح رائیگاں کر دیتے ہیں جو ہمیں تھوڑی دیر تک محظوظ کر کے خاکستر بن جانے کے لئے بھیجی گئی ہو۔ ایک جلیل القدر انسان کے ایسے خیر مقدم کو بھی ہیں کامل نہیں قرار دے سکتا۔

اس مسئلے پر کامل غور کرنے کے بعد غالباً ہر شخص آخر الذکر صورت کو زیادہ مذموم ٹھہرائے گا جو انسانی خصائل کی اس سے زیادہ افسوس ناک ابتریوں کا اظہار کرتی ہے جن کا ثبوت ہم کو باشندگان اسکینڈی نیویا کی پرستش سے ملتا ہے۔ محبت و تعریف کی بے جا افراط اچھی نہیں ہوتی۔ لیکن از راہ نخوت بجا محبت کا فقدان اس سے بھی بدتر ہے۔ مشاہیر پرستی کی صورت ہمیشہ بدلتی رہی ہے۔ یہ صورت اگرچہ ہر

عہد میں مختلف رہی، لیکن کبھی مکمل نہ ہوئی گو ہر زمانے کا میلان اس کی تکمیل کی طرف رہا ہے۔

ہم نے حضرت محمدؐ کا انتخاب اس وجہ سے نہیں کیا کہ آپؐ افضل ترین پیغمبر ہیں بلکہ اس لئے کیا ہے کہ ہم آپؐ کے متعلق آزادی کے ساتھ اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ ہم میں سے کسی کے مسلمان ہو جانے کا اندیشہ نہیں، اس لئے میں آپؐ کے وہ تمام اوصاف بیان کر دینا چاہتا ہوں جو انصاف کے ساتھ ممکن ہیں۔ آپؐ کی تعلیمات سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ آپؐ کے ذہن میں دنیا کا کیا تصور تھا۔ اس کے بعد ہم اس کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں گے کہ اہل دنیا آپؐ کو کیا سمجھتے تھے۔ حضرت محمدؐ کے متعلق ہمارا موجودہ یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے کہ "آپ دغاباز اور کذب مجسم تھے اور آپ کا مذہب محض فریب و نادانی کا ایک مجموعہ ہے"۔ کذب و افترا کا وہ انبارِ عظیم جو ہم نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس ہستی کے خلاف کھڑا کیا خود ہمارے لئے شرمناک ہے۔ جب پوکاک[1]

---

[1] اڈورڈ پوکاک (۱۶۰۴ء–۱۶۹۱ء) انگریز متشرق اور انجیل کا عالم۔ یہ اپنے ان تصانیف کی وجہ سے مشہور ہے جو عرب کے موضوع پر ہیں۔ لندن کے بشپ اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے چانسلر ولیم لاڈ نے ۱۶۳۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی کی پروفیسری کا ایک عہدہ قائم کر کے اس پر پوکاک کو ... تھا۔

نے گروٹی لیس[1] سے پوچھا کہ "ہمارے پاس اس قصے کے متعلق کیا ثبوت ہے کہ محمدؐ نے ایک کبوتر سدھار رکھا تھا جو ان کے کانوں سے مٹر کے دانے چنا کرتا اور جسے وہ کہتے کہ فرشتہ وحی لایا ہے؟" تو گروٹی لیس نے جواب دیا کہ "اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے"۔ اب دراصل وہ وقت آ پہنچا ہے کہ اس قسم کی مہمل باتیں چھوڑ دی جائیں۔ اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ انسانوں کے حق میں شمع ہدایت کا کام دے رہے ہیں۔ یہ اٹھارہ کروڑ انسان بھی ہماری طرح خدائے تعالیٰ کے دست قدرت کا نمونہ تھے۔ بندگانِ خدا کی بیشتر تعداد آج بھی کسی اور شخص کی بہ نسبت محمدؐ کے اقوال پر اعتماد رکھتی ہے۔ کیا ہم کسی طرح اسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ سب روحانی بازی گری کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا جس پر اتنے بندگانِ خدا ایمان لائے اور گزر گئے؟ اپنی حد تک تو میں ایسا قیاس نہیں قائم کر سکتا۔ اسے ماننے سے پہلے میں بہت سی بعید از قیاس باتوں کو تسلیم کر لوں گا۔ اگر اس دنیا میں مکر و فریب اس قدر فروغ پا سکتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی

---

[1] ہیوگو گروٹی لیس (۱۵۸۳ء - ۱۶۴۵ء) ڈچ ماہر سیاسیات و دینیات اور مقنن۔ دنیا کا نہایت ذہین آدمی سمجھا جاتا ہے، جس نے بہت کم عمر میں انتہائی غیر معمولی قابلیت حاصل کر لی تھی۔

دنیا کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے۔

افسوس! ایسے نظریئے سخت افسوس ناک ہیں۔ اگر ہم کائنات کی کسی چیز کے متعلق صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایسے نظریوں کو قطعاً غلط سمجھنا چاہیئے۔ یہ نظریئے عہدِ ارتیاب کی پیداوار ہیں جو سخت ترین روحانی جمود کو ظاہر کرتے ہیں اور جن سے ارواحِ انسانی کی موت کا پتہ چلتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر ملحدانہ نظریہ اس دنیا میں آج تک نہ قائم کیا گیا ہوگا۔ ایک جھوٹا آدمی اور کسی مذہب کا بانی ہو! جھوٹا آدمی اینٹ اور چونے کا ایک مکان تو بنا نہیں سکتا۔ اگر کسی شخص کو مٹی، چونے اور اُن اشیا کے خواص کا صحیح علم نہ ہو اور وہ ان کا پورا لحاظ نہ رکھے جو مکان کی تعمیر میں استعمال ہوتے ہیں تو اس کا بنایا ہوا مکان مکان نہ کہلا سکے گا بلکہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا۔ ایسا مکان بارہ صدی تک نہیں قائم رہ سکتا اور نہ اس میں اٹھارہ کروڑ انسان سما سکتے ہیں۔ وہ تو فوراً گر جاتا ہے۔

انسان کو قوانینِ قدرت کے مطابق عمل کرنا اور اشیاء کی حقیقت و ماہیت سے بخوبی آگاہ ہونا چاہیئے، ورنہ قدرت اس کا ہرگز ساتھ نہ دے گی۔ کاغذ کی ناؤ کبھی چل نہیں سکتی۔ کیگ لی اوسٹرو[1] کی طرح بہت

---

[1] کیگ لی اوسٹرو کانٹ (۱۷۴۳ء - ۱۷۹۵ء) اطالوی نژاد کیمیاگر تھا جو مدت دراز
(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

سے انسان دنیا کے قائد بن جاتے ہیں اور اپنی فریب کاریوں کی بدولت دو دن کے لئے فروغ پا جاتے ہیں۔ لیکن ان کی مثال جعلی نوٹ کی ہے جس کو وہ تو بھنا لیتے ہیں مگر خمیازہ دوسروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ قدرت انقلابِ فرانس اور اسی قسم کے اور واقعات کی صورت میں بھڑک اٹھتی ہے اور انتہائی صداقت کے ساتھ جعلی نوٹوں کو جعلی ثابت کر دکھاتی ہے۔

لیکن ایک بڑے انسان کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سچا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک صداقت اس کی بنائے اساس ہے۔ مرابو[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) تک یورپ کے مختلف ممالک سے دغا و فریب کے ذریعے روپیہ وصول کرتا رہا۔ اس نے طرح طرح کی جھوٹی چیزیں تیار کیں اور مختلف الزاموں کی پاداش میں فرانس اور انگلستان میں سزایاب ہوا۔ آخر ۱۷۸۹ء میں اس کے لئے روما میں سزائے موت تجویز کی گئی جو بعد میں حبس دوام سے بدل دی گئی۔

[1] مرابو فرانس کا مشہور مدبر ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۹۱ء میں وفات پائی۔ فرانس کی سیاسیات میں اس نے بہت بڑا حصہ لیا۔ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے ایک سے زیادہ موقعوں پر اپنی عزت و آبرو معرض خطر میں ڈال دی اور ایک عالم کو اپنا دشمن بنا لیا۔

نپولین[1]، برنس[2]، کرامول[3] غرض جس شخص نے دنیا میں کچھ کیا ہے، اس نے پہلے خلوص نیت کو اپنا رہنما بنایا ہے اور ایسے ہی آدمی کو میں "مخلص انسان" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ خلوص، بڑا گہرا اور سچا خلوص، ہر بڑے انسان

---

[1] نپولین اول (بوناپارٹ) ۱۵ راگست ۱۷۶۹ء کو جزیرۂ کاسیکا میں پیدا ہوا۔ ۱۷۸۹ء میں ایک معمولی عہدے پر فوج میں ملازم ہوا۔ اپنی خداداد قابلیت سے یہاں تک ترقی کی کہ ۱۷۹۹ء "فسٹ کونسل" کے نام سے فرانس کا صدر ہو گیا۔ ۱۸۰۴ء میں "نپولین اول شہنشاہ فرانس" کے لقب سے مملکت فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ اس کی غیر معمولی فتوحات اور فوق العادتہ کارنامے اگر تفصیل سے بیان کئے جائیں تو شاید اس کے لئے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں۔ آخر ۱۸۱۵ء میں ڈیوک آف ولنگٹن نے اسے جنگ واٹرلو میں شکست دی اور وہ سینٹ ہلینا میں قید کر دیا گیا جہاں ۱۸۲۱ء میں یہ فاتح اعظم نذر اجل ہو گیا۔

[2] ملاحظہ ہو فٹ نوٹ صفحہ نمبر (۱۹) پر

[3] الیور کرامول (۱۵۹۹ء - ۱۶۵۸ء) انگلستان کا مایۂ ناز مدبر تھا جس نے کرنل کی حیثیت سے بہت سی فوجی خدمات اور مدبر کی حیثیت سے ملک کی بہت سی سیاسی خدمات انجام دیں۔

کی پہلی خصوصیت ہے۔ ایسا خلوص نہیں جو آپ اپنی تعریف کرے۔ وہ تو بالکل بے کار ہے۔ ایسا خلوص جو تنگ ظرف خود ستا اور خود بین ہو، وہ عموماً غرور کی علامت ہوتا ہے۔ جلیل القدر انسان کا خلوص اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ اس کا اظہار بلکہ احساس تک نہیں کر سکتا۔ نہیں! بلکہ میرے خیال میں اسے اپنی نارسائی کا اعتراف ہوتا ہے، کیونکہ کون ایسا شخص ہے جو ایک دن کے لئے بھی قانونِ صداقت پر پوری طرح عمل کر سکے؟ اس لئے کوئی بڑا انسان اپنی صداقت کا دعویٰ کرنا تو درکنار اس کا تصور تک دل میں نہیں لاتا۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ صداقت اس کی اختیاری نہیں ہوتی، یعنی اُسے صادق ہوئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اس کی نگاہوں میں زندگی کی حقیقتِ کبریٰ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ہر چند کوشش کرے لیکن اس حقیقت کے مہیب احساس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یہ بات اس کی فطرت میں داخل ہوتی ہے اور یہی سب سے بڑھ کر اس کی عظمت کا باعث ہے۔ اس کے نزدیک یہ کائنات خوف و استعجاب سے مملو اور موت و حیات کی طرح حقیقی ہے۔ دنیا کے تمام انسان اس حقیقت کو بھول جائیں اور نمود و نمائش کرتے پھریں، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ہر وقت حقیقت کا شعلۂ آتشیں دہکتا رہتا ہے۔ میں چاہتا

ہوں کہ آپ اُسے بخوبی سمجھ جائیں کہ میرے نزدیک بڑے انسان کی یہ پہلی تعریف ہے۔ یہ خصوصیات کسی معمولی انسان میں بھی ہو سکتی ہیں۔ تمام بندگانِ خدا کے لئے ان کا وجود ممکن ہے، لیکن ایک بڑے انسان کے لئے ان کا وجود لازمی ہے۔

ایسے ہی شخص کو ہم "اوریجنل انسان" کہتے ہیں۔ اس کی فطرت کسی پہلے مرقع کی نقل نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسا قاصد ہے جو پردۂ غیب سے پیغام دے کر ہمارے پاس بھیجا گیا، خواہ ہم اسے شاعر کہیں یا پیغمبر یا خدا۔ بہرصورت ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ساری نوعِ انسان کے الفاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت اشیاء کی روحِ رواں سے نکلتا ہے اور رات دن اسی میں بسر کرتا ہے۔ اوہام اُس سے اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتے۔ وہ اندھا ہو، بے خانماں ہو، مصیبت زدہ ہو، روزمرہ کی گفتگو میں منہمک ہو، لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ کیا اس کے الفاظ فی الحقیقت ایک طرح کی وحی نہیں ہیں؟ جب اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی اور لفظ ہی نہ ہو تو پھر ہم وحی کے سوا اُسے کس نام سے تعبیر کریں؟ ایسے انسان کی ہستی قلبِ کائنات سے ابھرتی ہے اور وہ اشیاء کی بنیادی حقیقت کا ایک جزو ہوتا ہے۔ خدا نے

تعالیٰ نے اس دنیا میں بہت سے الہام بھیجے ہیں۔ لیکن کیا یہ شخص اس کا آخری اور تازہ ترین مظہر نہیں ہے؟ " اس کی عقل وحی کی پروردہ ہوتی ہے" اس لئے سب کو چھوڑ کر ہمیں اس شخص کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

ہم کسی طرح حضرت محمدؐ کو حریص و منصوبہ باز اور ان کی تعلیمات کو جہل و نادانی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اُمیانہ پیغام جو آپؐ لے کر آئے تھے، بالکل سچا تھا۔ وہ ایک آواز تھی جو پردۂ غیب سے بلند ہوئی۔ اس شخص کے نہ اقوال جھوٹے تھے نہ افعال۔ اُس میں تنک ظرفی اور نمائش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ زندگی کا ایک جلوۂ تاباں تھا جو خاص سینۂ فطرت سے ہویدا ہوا اور جسے خالق عالم نے کائنات کو منور کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

ہم عام طور پر لغزشوں کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں جن کے فروغ کا انبار اصل حقیقت کو چھپا دیتا ہے۔ لغزش سے کیا مراد ہے؟ میری رائے میں عظیم ترین لغزش احساسِ معصومیت کا نام ہے۔ انجیل کا مطالعہ کرنے والے اس رمز کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ انجیل میں " خدا کے برگزیدہ بندہ" کا خطاب کسے دیا گیا؟ اسرائیلی بادشاہ داؤد کو جن سے بدترین گناہ سرزد ہو چکے تھے اور جن کی زندگی میں گناہوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اسی بنا پر غیر مذاہب کے پیرو ہم سے حقارت سے پوچھتے ہیں کہ " کیا آپ کے نزدیک یہی خدا کے برگزیدہ بندے ہیں؟" لیکن میرے نزدیک ان کی یہ حقارت کوئی وقعت

نہیں رکھتی۔ لغزشوں کی کیا اہمیت ہے اور انسانی زندگی کے ظاہری اعمال کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے اگر اس کی باطنی کیفیت یعنی ترغیبِ گناہ اور ندامتِ گناہ کی باہمی کشمکش کو نظرانداز کر دیا جائے - ایسی کشمکش جو راہِ راست سے بھٹکنے کے باوجود کبھی ختم نہ ہو۔ وہ قوت جو انسان کو راہِ راست پر چلاتی ہے اس کی اختیاری نہیں ہوتی - کیا صفاتِ انسانی میں "ندامتِ گناہ" سب سے زیادہ ملکوتی صفت نہیں ہے؟ میرے نزدیک بدترین گناہ اسی متکبرانہ احساس بے گناہی کا نام ہے جو دراصل ایک طرح کی روحانی موت ہے۔ ایسا قلبِ خود بیں، اخلاص عجز اور حقیقت شناسی سے معرّا ہو گا - وہ ایک جسد بے روح ہے جو خالص تو ہے مگر ایسا جیسے خشک ریت! حضرت داؤد ؑ کے حالاتِ زندگی جو زبور میں بیان کئے گئے ہیں، میرے نزدیک اس دنیا میں ایک انسان کے اخلاق ارتقاء اور جدوجہد کا بہترین نمونہ ہیں - اربابِ نظر کو ان واقعات میں ایک سرگرم انسانی روح درجۂ کمال پر پہنچنے کے لئے مسلسل کشمکش کرتی دکھائی دے گی - ایسی کشمکش جو بارہا راہ راست سے بھٹک گئی - ایسی بھٹکی کہ قعرِ ہلاکت تک پہنچ گئی، لیکن کبھی ختم نہ ہوئی - بلکہ ہمیشہ اشک ندامت اور عزم پیہم کے ساتھ از سرِ نو شروع ہوئی - اے بے کس فطرتِ انسانی! کیا انسانی زندگی کا سفر مسلسل ٹھوکریں کھائے بغیر طے ہو سکتا ہے؟ اس سے زیادہ اس کے بس میں کیا ہے کہ وہ زندگی

کے اس سخت کوشش عنصر میں جہد پیہم کرتا رہے، قعرِ مذلت میں گرے اور پھر اٹھ کر با دیدۂ گریاں، با سینۂ بریاں آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اس کی طلب صادق اور کشاکش لامتناہی ہو۔ اگر اصل صداقت پر مبنی ہوئی تو ہم اس کے بہت سے فروع سے قطع نظر کر سکتے ہیں لیکن فروع اصل کی طرف کبھی ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر محمدؐ کی لغزشیں مان بھی لی جائیں تو ہم ان کا اندازہ کرنے میں سخت غلطی کر رہے ہیں اور اس میں الجھے رہنے سے ہم کبھی ان کے رموز کی لم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ اس لئے اب ہم اس تمام بحث کو ختم کرتے ہیں اور یہ یقین کر کے کہ فی الحقیقت آپ ایک سچا پیغام لے کر آئے تھے، معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا تھا۔

عرب جس میں حضرت محمدؐ کی ولادت ہوئی تھی، اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک غیر معمولی قوم ہے۔ اس کا ملک خود ایک غیر معمولی حیثیت رکھتا ہے جو ایسی قوم کے شایاں ہے۔ ننگی چٹانوں کے ناقابلِ گزر پہاڑ، بڑے بڑے مہیب ریگستان، جن میں خال خال سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ جہاں کہیں پانی ہے وہاں سبزہ، حسن، خوشبودار مہندی کے درخت، نخلستان اور لوبان کے درخت ملتے ہیں۔ ذرا اس لق و دق ریگستان کا تصور کیجئے جہاں ہر طرف ریت ہی ریت نظر آتی ہے اور جہاں ہر وقت سکون مطلق طاری رہتا ہے۔ ایسے ریگستان مختلف آباد حصوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں جہاں

انسان کائنات میں اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہے۔ دن کے وقت آفتاب کی ناقابل برداشت حرارت آتش فشانی کرتی رہتی ہے اور رات کو چرخ نیلوفری پر تارے چھٹکے نظر آتے ہیں۔ ایسا ملک ایسی ہی قوم کے شایاں ہے جس کے افراد جسم کے پھرتیلے اور طبیعت کے گہرے ہوں۔ عربوں کی فطرت میں حد درجہ مستعدی اور چالاکی کے باوجود نہایت غور و فکر اور جوش و سرگرمی پائی جاتی ہے۔ ایرانی "مشرقی فرانسیسی" کہلاتے ہیں۔ ہم عربوں کو "مشرقی اطالویوں" کے نام سے یاد کریں گے۔ ان کی فطرت اعلیٰ ہے۔ اُن کے جذبات اگرچہ نہایت تند و تیز ہوتے ہیں لیکن ان پر انہیں بلا کا قابو حاصل ہے، جو شرافتِ نفس اور فطرتِ عالی کی دلیل ہے۔ ایک وحشی بدو ایک اجنبی کا اس طرح خیر مقدم کرتا ہے گویا وہ اس کے خیمہ کی ساری املاک کا حقدار ہے۔ یہ اجنبی خواہ اس کا کیسا ہی دشمن ہو لیکن وہ اس کی ضیافت کے لئے اپنے جانور ذبح کرے گا اور تین دن تک اس کی خاطر تواضع کو اپنا مقدس ترین فرض سمجھے گا۔ اس کے بعد اُسے رخصت کرے گا۔ لیکن رخصت کرنے کے بعد اگر اُس کا بس چلے تو ایک دوسرے قانون کی اتباع میں جسے وہ ایسا ہی مقدس سمجھتا ہے، اس کے قتل سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ جو حال عربوں کے افعال کا ہے وہی ان کے اقوال کا۔ یہ لوگ باتونی نہیں ہوتے بلکہ

کم سخن ہوتے ہیں۔ لیکن جب بولنے پر آتے ہیں تو فصاحت کے دریا بہاتے ہیں۔ غرض یہ مخلص اور راست باز ہوتے ہیں جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے نسل کے اعتبار سے ان کا تعلق یہودیوں سے ہے۔ لیکن یہودیوں کی مکرو اور شدید سنجیدگی کے بجائے ان میں ایک عجیب طرح کی خوش ادائی اور دلکشی پائی جاتی ہے جو یہودیوں میں نہیں ہوتی۔ طلوع اسلام سے قبل ان میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ سیل[1] لکھتا ہے کہ "جنوبی عرب کے بازار عکاظ میں سالانہ میلے لگا کرتے تھے جہاں مال تجارت کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ شاعر حصولِ انعام کے لئے نظمیں پڑھا کرتے اور لوگ انہیں سننے کے لئے جمع ہوتے تھے"۔

یہودیوں کی ایک خاص صفت جو ان عربوں میں پائی جاتی ہے اور جسے تمام اعلیٰ صفات کا حاصل کہنا چاہیئے، ان کی مذہبیت ہے۔

---

[1] جارج سیل (۱۶۸۰ء - ۱۷۳۶ء) ممتاز انگریز متشرق لندن کے ایک تاجر کا لڑکا تھا کچھ عرصے تک یہ سالیسٹر کی حیثیت سے پریکٹس کرتا رہا۔ اس کے بعد انجیل کے عربی ترجمے کی تصحیح کا کام اس کے سپرد ہوا۔ اس نے بہت سے مشرقی مشاہیر پر جنرل ڈکشنری میں آرٹیکل لکھے ہیں۔ اس کا انگریزی ترجمۂ قرآن بہت مشہور ہے جو ۱۷۳۴ء میں شائع ہوا۔

زمانۂ قدیم سے وہ اپنے اعتقاد کے مطابق سخت مذہب پرست رہے ہیں۔ انھوں نے صابئین کی طرح نجم پرستی کی، بہت سے موجودات قدرت کو پوجتے رہے اور ان کو مظہرِ ربانی اور جلوۂ یزدانی قرار دیا۔ یہ ان کی غلطی تھی۔ لیکن ہم اسے پوری طرح غلط بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ دستِ قدرت کی تمام صنعتیں ایک معنی میں مظہرِ ربّانی ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا' کیا ہم اب بھی تمام قدرتی اشیاء کی عظمت تسلیم کرنے کو ایک بڑا وصف نہیں سمجھتے اور اسے "شاعرانہ حسن" سے تعبیر نہیں کرتے؟

اگر کوئی شخص شاعر ہو تو اس کی عزت کی جاتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ شعر کہتا یا شعر گاتا ہے۔ اس عزت و حرمت میں بھی پرستش کی ایک ہلکی سی جھلک موجود ہے۔ غرض یہ کہ عربوں میں بہت سے مذہبی پیشوا گزرے ہیں جو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اپنے قبیلے کو تعلیم دیتے تھے۔ ان غیر متمدن لوگوں کے سینے میں زہد و اتقا اور شرافت نفس کے جو جذبات موجزن تھے، ان کا بہترین اور بیّن ثبوت زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک ہمیں ایک ایسی چیز سے ملتا ہے جو مرئی اور محسوس ہے۔ انجیل کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ خود ہماری "کتاب ایوب" اسی خطّۂ زمین میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے متعلق جتنے نظریئے اب تک قائم ہوئے، ان سب سے قطع نظر کر کے میں اسے زورِ قلم کا بہترین کارنامہ سمجھتا ہوں۔

اس میں فرقہ بندی یا حب الوطنی کے برخلاف ایسی اعلیٰ وسعت و ہمہ گیری پائی جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ عبرانی کتاب نہیں - یہ بلند پایہ کتاب ساری نوعِ انسان کے لئے ہے - یہ قسمتِ انسانی اور فطرتِ الٰہی کے عقدۂ لاینحل کے متعلق ہماری پہلی اور قدیم ترین روئیداد ہے جس کا طرزِ بیان نہایت صاف اور دلآویز ہے - اس کی سادگی، اس کا ترنم اور اس کی لطافت بیان میں نہیں آسکتی - اس میں دیدۂ بینا اور عقلِ رسا کے ایسے آثار پائے جاتے ہیں جن میں روحانی اور مادی ہر قسم کی چیزوں کے لئے صحیح نگاہ اور بصیرت موجود ہے - اس کی اچھوتی تشبیہات اور استعارات کی نظیر نہیں ملتی -

اس سازِ کہن میں شادی و غم کے وہ نغمہائے شیریں پنہاں ہیں جو قلبِ انسانی میں موجِ دریا اور چادرِ مہتاب کے سے رنگین جلوے پیدا کرتے ہیں - میں سمجھتا ہوں کہ ادبی لطافتوں کے اس نظر فریب مرقع کا جواب نہ بائیبل میں مل سکتا ہے نہ کہیں اور -

بُت پرست عربوں کے ہاں منجملہ اور قدیم ترین اشیائے پرستش کے ایک حجر الاسود تھا - یہ اب بھی بمقام مکہ اس عمارت میں رکھا ہوا ہے جو کعبہ کے نام سے موسوم ہے - ڈیوڈرس سی کیولس[1] صاف و صریح طور پر

---

[1] ڈیوڈرس سی کیولس پہلی صدی عیسوی کا یونانی مورخ جزیرہ سسلی میں پیدا ہوا - اس نے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

کعبہ کو اپنے عہد (یعنی تقریباً پچاس سال قبل مسیح) کی قدیم ترین اور مقدس ترین عبادت گاہ بیان کرتا ہے۔ سلوسترے دی ساسی[1] لکھتا ہے کہ "بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حجر الاسود آسمانی پتھر ہے۔"

ایسی صورت میں کیا عجب ہے کہ کسی شخص نے اسے آسمان سے گرتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔ اب یہ پتھر چاہ زمزم کے قریب رکھا ہوا ہے اور کعبہ ان دونوں کے اوپر تعمیر[2] کیا گیا ہے۔ کنواں جس میں سخت زمین سے سیل زندگی کی طرح پانی ابل رہا ہو، ہر جگہ خوشنما اور دلکش معلوم ہوتا ہے خصوصاً گرم ممالک میں جہاں وہ زندگی کی شرطِ اوّل ہے۔ چاہِ زمزم کی وجہ تسمیہ پانی جھرنے کی آواز ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی کنواں ہے جسے ہاجرہؓ نے اسمٰعیلؑ کے ساتھ جنگل میں دیکھا تھا۔ غرض حجر الاسود اور یہ کنواں

(بقیہ صفحہ ۳۴) ایک مبسوط تاریخ لکھی ہے جس میں گیارہ سو اڑتالیس سال کے واقعات جمع کئے ہیں۔

[1] سلوسترے دی ساسی فرانسیسی مستشرق ۱۷۵۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۸ء میں وفات پائی۔

[2] چونکہ حدودِ حرم میں عیسائی بآسانی نہیں پہنچ سکتے، اس لئے یورپین مورخین وہاں کے حالات میں اکثر غلطی کرتے ہیں۔ کعبہ حجر الاسود اور چاہ زمزم کے اوپر تعمیر نہیں کیا گیا بلکہ یہ ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلہ پر علیحدہ علیحدہ واقع ہیں۔

اب بھی مقدس سمجھا جاتا ہے جس پر ہزارہا سال سے کعبہ قائم ہے۔

یہ کعبہ ایک عجیب چیز ہے۔ اس وقت بھی وہ سیاہ غلاف اوڑھے کھڑا ہے جو خلفا ہر سال اس کے لئے بھیجتے ہیں۔ اُس کی بلندی ستائیس ہاتھ ہے اور اس کے اطراف ستونوں کے دو حلقے ہیں۔ یہ جگہ جھاڑ فانوس اور نادر سامانِ آرائش سے سجائی گئی ہے۔ یہ فانوس آج رات کو بھی روشن کئے جائیں گے اور ستاروں بھرے آسمان کے نیچے جگمگائیں گے۔ غرض یہ قدیم ترین عہد کی ایک معتبر یادگار ہے۔ یہ تمام مسلمانوں کا قبلہ ہے جس کی طرف دہلی سے لے کر مراکو تک کے بے شمار نمازیوں کی نگاہیں روزانہ پانچ مرتبہ پلٹتی ہیں۔ بلاشبہ چار دانگ عالم کا یہ مقدس ترین مرکز ہے۔ تمام قبائل عرب اس حجر اسود اور چاہ زمزم کی زیارت کو آتے تھے اور اسی تقدس کی وجہ سے مکّہ کو ایک شہر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

کسی زمانے میں مکّہ بہت بڑا شہر تھا مگر اب بہت ویران ہو گیا ہے کیونکہ اس میں شہر بننے کی قدرتی صلاحیت نہیں۔ وہ سمندر سے دور ننگی پہاڑیوں کے درمیان ریتیلے نشیب میں واقع ہے جہاں غلّہ تک باہر سے آتا ہے۔ لیکن وہاں اکثر زائرین کو مکان کی ضرورت تھی۔ پھر یہ قاعدے کی بات ہے کہ تمام مقاماتِ زیارات ہمیشہ تجارتی مرکز بھی بن جایا کرتے ہیں۔ ادھر زائرین جمع ہوئے کہ ساتھ ہی ساتھ تاجر بھی

پہنچے۔ جہاں لوگ ایک ضرورت سے جمع ہوتے ہیں، وہاں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی اور ضرورتیں بھی پوری کر سکتے ہیں جو مجمع کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ چنانچہ مکّہ سارے عرب کا مرکز بن گیا اور اس طرح اُسے مشرقی اور مغربی ممالک (شام، مصر اور اٹلی) کے درمیان سب سے بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ کسی زمانے میں مکّہ کی آبادی ایک لاکھ تھی جو مشرقی اور مغربی پیداوار کا لین دین کرتی اور جلب منفعت کے لئے غلّہ اور دیگر اشیائے خورد و نوش بہم پہنچاتی۔ وہاں کی حکومت ایک بے قاعدہ اعیانی جمہوریت تھی جس میں مذہبیت کی جھلک پائی جاتی۔

کسی بڑے قبیلے کے دس آدمی بے قاعدہ طور پر منتخب کر لئے جاتے اور مکّہ کی حکومت اور کعبہ کی تولّیت اُن کے سپرد کر دی جاتی۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں قریش کا قبیلہ سب میں ممتاز تھا۔ آپؐ کا خاندان اسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ باقی قوم جس کو ریگستانوں نے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، اسی قسم کی غیر منتظم حکومت کے ماتحت تھی جس کی عنان ایک یا زیادہ شیخ قبیلہ کے ہاتھ میں ہوتی۔ قوم کے افراد میں گلہ بان، مزدور، تاجر، ڈاکو غرض سب ہی شامل تھے۔ یہ اکثر ایک دوسرے سے دست بہ گریباں رہتے اور ان میں کوئی باہمی شیرازہ بندی بجز اس اجتماع کے نہ تھی جو کعبہ میں ہوا کرتا۔ یہاں زبان اور نسل کی قدرتی اور ناقابلِ تفریق

یکسانیت عرب بت پرستی کی مختلف صورتوں کو لاکر ایک مرکز پرستش پر جمع کردیتی ۔ اس حالت میں عرب اپنی بہت سی خوبیوں کے ساتھ مدتِ دراز سے دنیا کی نگاہوں سے چھپے ہوئے انجان طور پر اس موقع کے منتظر تھے جو انہیں سارے عالم سے روشناس کرادے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بت پرستی متزلزل ہوچکی تھی اور ان کی حالت میں ابتری اور انتشار پیدا ہوگیا تھا ۔ دنیا کے اہم ترین واقعہ یعنی حضرت مسیح کی ولادت اور وفات کی (جس نے دنیا کی تمام قوموں میں انقلاب عظیم پیدا کردیا تھا) اڑتی اڑتی خبریں چند صدیوں میں عرب میں بھی پہنچیں اور ایک ہیجان پیدا کردیا ۔

عربوں کی یہ حالت تھی کہ ۵۷۰ء میں حضرت محمدؐ ان میں پیدا ہوئے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ۔ آپؐ کا تعلق قبیلہ قریش کے خاندان بنی ہاشم سے تھا ۔ گو خود آپ غریب تھے لیکن شہر کے اکثر معززین سے آپ کا رشتہ تھا ۔ ولادت سے کچھ پہلے آپ کے والد کا انتقال ہوگیا ۔ ہنوز آپ چھ برس کے نہ ہوئے تھے کہ آپ کی والدہ بھی (جو اپنے حسن، قابلیت اور سوجھ بوجھ کے اعتبار سے شہرت رکھتی تھیں) رحلت کرگئیں ۔ اس طرح آپؐ کی پرورش آپ کے دادا (عبدالمطلب) کو تفویض ہوئی جن کی عمر اُس وقت سو برس کے قریب تھی ۔ آنحضرتؐ کے والد حضرت عبداللہ، عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے تھے ۔ عبدالمطلب نے اپنی صد سالہ

آنکھوں سے عبداللہ کی تصویر کو حضرت محمدؐ کے پیکر میں جلوہ پیرا دیکھا اور اس درِ یتیم سے بے انتہا محبت کرنے لگے۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ "اہلِ خاندان کو اس طفلِ صاحبِ جمال کی بڑی حفاظت کرنی چاہیئے کیونکہ ان میں اب تک کوئی ایسا گوہر بے بہا نہیں پیدا ہوا"۔ لیکن دو سال بعد عبدالمطلب نے بھی وفات پائی اور آپؐ کی تربیت ابوطالب کے سپرد ہوئی۔ وہ آپؐ کے سب سے بڑے چچا اور سارے خاندان کے بزرگ تھے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالب نہایت منصف مزاج اور سمجھ دار آدمی تھے اور انھوں نے آنحضرتؐ کی تربیت بہترین عربی طریقے پر کی۔

آنحضرتؐ نے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد اپنے چچا کے ساتھ تجارت اور دوسرے اغراض کے لئے مختلف سفر کئے۔ اٹھارہویں سال انہیں کے ساتھ ایک جنگ[1] میں بھی شرکت فرمائی۔ لیکن آپؐ کا اہم ترین سفر وہ ہے جو اس سے چند سال قبل شام کے میلوں میں شرکت کی غرض سے آپؐ نے اختیار کیا تھا۔ اس موقع پر پہلی دفعہ آپؐ کو بیرونی دنیا کے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور آپؐ اُس عنصر جدید (یعنی مذہب عیسوی) سے

---

[1] یہ جنگ حرب فجار کے نام سے مشہور ہے۔

واقف ہوئے جو آپؐ کے لئے بے انتہا اہم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سفر کے اثناء میں حضرت ابو طالب اور آپؐ سرجیس نامی ایک نسطوری راہب کے ہاں ٹھہرے تھے جس نے آپؐ کو مذہب عیسوی کی تعلیم دی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے کم عمر کو کوئی راہب کیا تعلیم دے سکتا ہے۔ غالباً نسطوری راہب کے اس واقعہ سے بہت مبالغہ کیا جاتا ہے کیونکہ آنحضرتؐ کی عمر اس وقت چودہ سال کی تھی اور آپؐ عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ شام میں بہت سی باتیں آپؐ کے لئے بالکل نئی اور سمجھ سے باہر تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ آپؐ کی نگاہوں نے وہاں بہت سی چیزیں دیکھیں اور ان کے عکس کو محفوظ کر لیا جو اگرچہ اُس وقت ایک معمہ رہا، لیکن بعد میں چل کر عجیب و غریب طریقے سے مختلف نظریات اور معتقدات کی صورت میں نمایاں ہوا۔ اغلب یہ ہے کہ شام کا سفر آنحضرتؐ کی آئندہ زندگی کے بہت سے اہم واقعات کا پیش خیمہ تھا۔

ایک اور ضروری بات جو ہمیں ذہن نشین رکھنی چاہیئے یہ ہے کہ آپؐ نے کسی مکتب میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ جن معنوں میں ہم آج کل مکتب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ آپ کو بالکل میسّر نہ تھی۔ عرب میں لکھنے کا رواج اسی زمانے میں شروع ہوا تھا اور یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے

کہ آپؐ لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ ریگستان کی زندگی اور اس کے تجربات آپؐ کی کل تعلیم تھی۔ اس کائنات کے متعلق آپؐ کی معلومات صرف اُنہی مشاہدات پر مبنی تھیں جن کا آپؐ کو اس غیر معروف ماحول میں صرف اپنی نگاہوں اور اپنے خیالات کے ذریعے موقع ملا تھا۔ غور کیجئے تو یہ امر نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کتابی علم سے بالکل ناآشنا تھے اور آپؐ کا ذریعۂ معلومات تمام تر وہی تھا جو آپ اپنی نگاہوں سے دیکھتے تھے یا جو اُس دور افتادہ ریگزار عرب میں کچھ اڑتی خبریں سن لیتے تھے۔ علم و حکمت کا وہ ذخیرہ جو آپؐ کے گرد و پیش یا آپؐ سے دور اور اقطاع عالم میں موجود تھا، آپؐ اس سے کوئی استفادہ نہ کر سکتے تھے اور اُن انبیاء کی محترم و مشعل بردارِ حقیقت ہستیوں میں سے جو مختلف ملکوں اور عہدوں میں گزری ہیں کوئی بھی آپؐ سے براہ راست شرف تکلم[1] حاصل نہ کر سکتی تھی۔ اس سینۂ صحرا کی گہرائی میں آپؐ بالکل تنہا رہے اور صرف درسگاہِ فطرت اور اپنے خیالات کی فضا میں نشو و نما پائی۔

لیکن کہا جاتا ہے کہ ابتدائے عمر سے آپؐ میں غور و فکر کی عادت

---

[1] ہم کلام نہ ہو سکتی تھی۔

تھی۔ آپؐ اپنے حلقۂ احباب میں ''الامین'' کے لقب سے یاد کئے جاتے کیونکہ راست باز اور دیانت دار تھے۔ آپؐ کا ہر فعل، ہر قول اور ہر خیال صداقت و دیانت پر مبنی ہوتا تھا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ آپؐ کا ہر قول پُر معنی ہوتا۔ آپؐ کم سخن تھے اور بے ضرورت بات نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب کبھی بات کرتے تو آپؐ کی گفتگو مدبرانہ، حکیمانہ اور مخلصانہ ہوتی اور آپؐ ہمیشہ نفسِ مطلب پر روشنی ڈالتے۔ اسی قسم کا کلام گفتگو کے قابل ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ساری عمر لوگ آپ کو نہایت متین، محبت کرنے والا اور راست باز سمجھتے رہے۔ باوجود فطری سنجیدگی اور اخلاص کے آپؐ متواضع، ملنسار، دوستی کے قابل اور خوش طبع تھے اور ایک خندۂ دلفریب آپؐ کے چہرہ پر پایا جاتا تھا۔ بعض لوگوں کی ہنسی ان کی ریاکاری کا آئینہ ہوتی ہے۔ وہ صحیح طور پر ہنس کبھی نہیں سکتے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ صاحبِ جمال تھے۔ آپؐ کے حسین چہرے سے ذکاوت و دیانت ٹپکتی تھی۔ آپؐ کا رنگ گندمی اور آنکھیں سیاہ چمکتی ہوئی تھیں۔ مجھے تو آپؐ کی وہ رگِ جبیں کبھی پیاری معلوم ہوتی ہے جو غصے کے وقت پھول کر سیاہ ہو جاتی تھی۔ یہ بنو ہاشم کی ایک نشانی تھی جو آنحضرتؐ کی پیشانی میں نمایاں طور پر پائی جاتی تھی۔ آپؐ الوالعزم اور جوشیلے ہونے کے ساتھ منصف مزاج اور صداقت پسند تھے۔ غرض ہم

اس حالت میں اس ہستی کو ناتربیت یافتہ جوش و حرارت سے لبریز قلب صحرا میں اپنا کارنامۂ زندگی مرتب کرتے دیکھتے ہیں۔ اسی زمانے میں خدیجہ نام کی ایک متموّل بیوہ سے آپؐ کا تعارف ہوا، جن کا اسباب تجارت لے کر آپؐ پھر شام تشریف لے گئے اور نہایت حسن و خوبی سے خدمت مفوّضہ انجام دے کر اُن سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ عرب مورخین نے آپؐ کی شادی کے نہایت دلچسپ اور قرینِ قیاس واقعات لکھے ہیں۔ اُس وقت آپؐ کی عمر پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ اگرچہ چالیس سال کی ہو چکی تھیں لیکن ہنوز ان کے چہرے سے حسن کے آثار زائل نہیں ہوئے تھے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس محسن بیوی سے آپؐ کے تعلقات نہایت محبت آگیں، خوشگوار اور شگفتہ تھے۔ آپؐ ہمیشہ انھیں سچے دل سے چاہتے رہے۔ یہ امر کہ آپؐ نے جوشِ شباب کے ختم ہونے تک بالکل معمولی طریقے پر اور نہایت سادگی و خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزارے، بجائے خود ہمارے اس خیال کی تکذیب کرتا ہے کہ آپؐ کی نیت میں کسی طرح کا مکر و فریب تھا۔

چالیس سال کی عمر تک آپؐ نے کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ آپؐ کی زندگی کے تمام خلاف عادت واقعات۔ اصلی اور مفروضہ۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد یعنی پچاسویں سال سے شروع ہوئے۔ اُس وقت تک آپؐ کی ساری "ہوس"، پاک زندگی بسر کرنے کے لئے تھی اور آپؐ کی "شہرت" یعنی ہمسایوں

کا خیالِ نیک آپؑ کے لئے بالکل کافی تھا۔ جب بڑھاپا آ پہنچا، ساری گرمئ شباب ختم ہو گئی اور آپؑ کے لئے اس دنیا میں صرف اطمینان و عافیت ہی ایک چیز باقی رہی تو اس وقت آپؑ کو ہوس پرستی کی سوجھی اور اپنے سارے گزشتہ خصائل و فضائل پر پانی پھیر کر ایک ایسی شے کے لئے مکر و فریب اختیار کیا جس سے اب کسی طرح متمتع نہ ہو سکتے تھے۔ اپنی حد تک تو میں ایسے قیاس کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

نہیں! نہیں! اس سیہ چشم، پاک طینت اور صاف باطن انسان میں (جسے مادرِ صحرا نے اپنی آغوشِ شفقت میں پالا تھا) جذبۂ ہوس پرستی اور شہرت طلبی نہیں بلکہ کچھ اور ہی خیالات موجزن تھے۔ اس قسم کی باتوں سے یہ بزرگ و برتر جان پاک تھی جسے خلوص و صداقت کے بغیر گزر ہی نہیں۔ جس کے خمیر میں خود فطرت اخلاص کو جگہ دیتی ہے۔ جس وقت اور لوگ اوہام میں مبتلا تھے اور اسی پر اڑے رہنے کے لئے جنگ و جدل کر رہے تھے، اس شخص کی عقل پر وہم و گمان کا پردہ نہ پڑ سکا۔ وہ اپنی روح اور حقائق اشیا کے ساتھ سب سے الگ تھا جیسا کہ میں کہہ چکا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے رازِ ہستی اپنی بیم و رجا کے ساتھ روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ جس کے وجود کو کسی طرح کا وہم و گمان پوشیدہ نہ کر سکا۔ یہ صفت جسے ہم نے "خلوص" کے لفظ سے تعبیر کیا، درحقیقت صفاتِ

ایزدی کا ایک پرتو ہے اور ایسے انسان کی آواز دراصل ہاتفِ غیب کی آواز ہے جسے لوگ انتہائی توجہ سے سنتے ہیں اور انھیں سُننا چاہیئے کیونکہ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔

مدت دراز سے سفر اور حضر میں ہزاروں خیالات اس شخص کے دل میں موجزن تھے کہ "میں کون ہوں اور یہ لا انتہا شے کیا ہے جس میں میں رہتا ہوں اور جو اصطلاح عام میں 'کائنات' کہلاتی ہے؟ موت و حیات کیا چیز ہے اور میرا ایقان و عمل کیا ہونا چاہیئے؟" کوہِ حرا اور کوہِ سینا کی ہیبت ناک چٹانیں، ریگِ بیاباں اور انجم فلک اس کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ آخر اس انسان کی رُوحِ پاک اور الہامِ ربّانی کو جو اس روحِ پاک میں جلوہ گر تھا، یہ مسائل حل کرنے پڑے۔

یہ ایسے مسائل ہیں جن کے متعلق ہر شخص کو اپنے دل سے سوال کرنا چاہیئے اور جن کا حل معلوم کرنا خود ہمارا بھی فرض ہے۔ اس اُمّی شخص کے نزدیک یہ مسائل اس درجہ اہم تھے کہ ان کے مقابلے میں وہ باقی تمام چیزوں کو ہیچ سمجھتا تھا۔ یونانیوں کے پیچیدہ مذہبی مناظرات، یہودیوں کے مبہم قدیم روایات، عربوں کی احمقانہ رسمِ بُت پرستی، غرض کسی چیز میں اُسے ان مسائل کا حل نہ ملتا تھا۔ ہیرو کی پہلی خصوصیت جسے اُس کی تمام خصوصیات کی ابتدا اور انتہا کہنا بجا ہوگا یہ ہے کہ وہ اشیاء کی

صورتِ ظاہری سے ان کی حقیقت کو جا پہنچتا ہے۔ رسم و رواج، معتبر اور مقبول روایات اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی۔ لیکن ان سب کو اس حقیقت کا مظہر ہونا چاہیئے جس کے مطابق اگر یہ نہ ہوں تو محض بُت پرستیاں ہیں، جس طرح کہ لکڑی کا ٹکڑا اگر خدائی کا دعویٰ کرے تو ایک حقیقت جُو طبیعت کے لئے مضحکہ خیز اور نفرت انگیز ہو جائے گا۔ بہترین طلائی کام کئے ہوئے بت، جن کی سردارانِ قریش پرستش کرتے تھے، اس شخص کے کس کام کے؟ گو ساری دنیا ان کی پرستش کرے لیکن کیا حاصل؟ اُس کی (آنحضرتؐ کی) نگاہوں کے سامنے تو حقیقتِ کبریٰ روز روشن کی طرح عیاں تھی جسے یا تو وہ قبول کرے یا فنا ہو جائے اور اس کے قبول یا رد کرنے کا صرف یہی وقت تھا۔ اس کے بعد ابد تک پھر کوئی موقع نہ تھا۔ حقیقتِ ازلی اس سے اس مطالبے کا جواب طلب کرتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہوس اس کے افعال کی محرک تھی تو یہ امر غور طلب ہو جاتا ہے کہ سارے عرب میں وہ کون سی چیز تھی جو اُس کو مطمئن کر سکتی؟ ہرقلِ یونان کا تاج، خسروِ ایران کا تاج، غرض ساری دنیا کے تاج و تخت اس کے کس کام کے تھے؟ جب کہ اس دنیا کے معاملات ہی اس کے پیشِ نظر نہ تھے بلکہ بہشت و دوزخ کے مسائل! دنیا کے تمام تاج و تخت چند روز کے بعد کیا ہوں گے؟ کیا شیخ مکہؐ یا شاہِ عرب بن کر عصائے شاہی ہاتھ میں لے لینے سے نجات

عقبیٰ حاصل ہو جاتی ہے؟ میرا یہ قطعی خیال ہے کہ نہیں حاصل ہو سکتی۔ اس لئے اس خیال کو بعید از قیاس بلکہ ناقابلِ برداشت قرار دے کر دل سے دور کر دینا چاہیئے کہ آنحضرتؐ نے جو کچھ کیا وہ ازراہِ مکر و فریب تھا۔

آنحضرتؐ کی عادت تھی کہ ہر سال ماہِ رمضان میں خلوت گزیں ہو جاتے۔ یہ اُس زمانے میں عرب کا عام دستور تھا۔ خصوصاً آنحضرتؐ جیسے انسان کے لئے تو یہ بالکل فطری اور نہایت سود مند ثابت ہو گا۔ کیونکہ پہاڑوں کی پُر سکوت فضا میں خاموشی کے ساتھ غور و فکر کرنے کا طریقہ بہت عمدہ ہے۔

آنحضرتؐ کی عمر کا چالیسواں سال تھا۔ آپ ماہِ رمضان میں تسبیح و تہلیل اور ان مسائل پر غور و فکر میں بسر کرنے کی غرض سے مکّے کے قریب کوہِ حرا کے ایک غار میں تشریف لے گئے تھے کہ ایک دن آپؐ نے اپنی بیوی خدیجہؓ سے (جو اس سال وہیں قریب ہی رہتی تھیں) فرمایا کہ فضلِ باریٔ تعالیٰ سے تمام عقدے حل ہو گئے۔ میرے سارے شکوک و شبہات رفع ہو گئے اور اب میں حقائق و معارف کو بے نقاب دیکھ رہا ہوں۔ یہ تمام اصنام و عقائد مہمل ہیں۔ مٹی کے کھلونے ہیں۔ سارے عالم کا مالک خدائے واحد ہے۔ ہمیں ان تمام بتوں سے منہ موڑ کر اُس ذاتِ واحد کے آگے سر جھکانا چاہیئے۔ صرف وہی ایک ذاتِ بزرگ و برتر

ہے۔ اُس کے سوا عظمت و رفعت کا کوئی شایاں نہیں۔ وہ حقیقت ہے یہ بُت مجاز۔ اُسی نے ہمیں پیدا کیا، وہی ہمیں پال رہا ہے اور ہم سب اسی کا پرتو ہیں ــــ اُسی حسنِ ازل کی ایک عارضی نقاب ہیں۔ "اللہ اکبر" یعنی خدا بزرگ و برتر ہے اور "اسلام" راضی برضائے الٰہی رہنا ــــ یہ سمجھنا کہ ہماری ساری قوت اسی کی کامل اطاعت میں مضمر ہے۔ وہ ہماری دنیا اور آخرت کے لئے جو چاہے کرے، جو کچھ ہمارے لئے بھیجے خواہ وہ موت ہو یا موت سے بدتر کوئی چیز، وہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ ہم اپنے کو اُسی کے حوالے کرتے ہیں۔

گوئٹے[۱] کہتا ہے کہ "اگر اسی کا نام اسلام ہے تو کیا ہم سب مسلمان نہیں ہیں"۔ بے شک! ہم میں سے جو بھی اخلاقی و روحانی زندگی کے قائل ہیں، وہ اس عقیدے کے پابند ہیں۔ عقل انسانی کا منتہائے کمال یہ نہیں ہے کہ وہ تقدیر کے آگے سپر ڈال دے، کیونکہ قدرت تو اسے مطیع و منقاد کرکے رہے گی، بلکہ یہ علم اور یقین کہ تقدیر نے ہمارے لئے جو چیز تجویز کی وہی بہترین ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کارخانۂ قدرت میں اپنی عقلِ نارسا کو دخل نہ دے

---

[۱] یان ولف گینگ گوئٹے (۱۷۴۹ء۔ ۱۸۳۲ء) جرمنی کا مشہور شاعر ہے جس کے مجموعۂ اشعار "دیوانِ مغرب" کا جواب علامہ اقبال نے اپنے فارسی مجموعۂ کلام "پیامِ مشرق" میں دیا ہے۔

اور یہ سمجھ لے کہ گو اس کی عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی لیکن درحقیقت یہ انتظامات ایک منصفانہ قانون کے تحت عمل میں آرہے ہیں، جس کی غایت نیک ہے اور اس کا کام اس قانون کا ساتھ دینا اور بے چون وچرا اس کی پابندی کرنا ہے۔

یہی میرے نزدیک وہ صحیح درسِ اخلاق ہے جس کا ہمیں اب تک علم ہو سکا۔ جونہی انسان تمام سطحی قوانین، عارضی حالات اور اندیشۂ سود و زیاں سے قطع نظر کرکے اس عالمگیر قانون کا ساتھ دیتا ہے، وہ صداقت و نیکی اور فتح و نصرت کی شاہراہ پر جا پہنچتا ہے۔ اس کی فتح مندی کا انحصار صرف اسی عظیم الشان مرکزی قانون کے ساتھ اتحادِ عمل پر ہے، جس کے بغیر وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس اتحادِ عمل کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ایقان ہے کہ ایسا کوئی قانون وجود رکھتا ہے اور یہ کہ وہ قانون سراسر مصلحت پر مبنی ہے۔ یہی اسلام کی روحِ رواں ہے اور یہی عیسائیت کا حاصل۔ عیسائیت بھی سب سے زیادہ راضی برضائے الٰہی رہنے پر زور دیتی ہے۔ اُس کے احکام کی رو سے ہمیں نفس سے مشورہ کرنے، اعتراضات لایعنی کی طرف متوجہ ہونے اور ارمان و آلام لاحاصل پر اعتنا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور ہماری نگاہوں کو جو ہر چیز بدترین اور نہایت ظالمانہ معلوم ہوتی ہے، وہ دراصل ایسی

نہیں ہے ۔ جو کچھ پیش آئے اُسے مشیت ایزدی سمجھ کر برداشت کرنا اور یہ کہنا چاہیئے کہ خدا دانا و بینا ہے ۔ اُس کی اسی میں کچھ مصلحت ہوگی ۔ وہ مجھے ہلاک کر ڈالے تب بھی میں اپنے کو اُس کے حوالے کروں گا ۔ اسلام عبارت ہے تزکیۂ نفس اور نفس کشی سے ۔ یہ عقل کا وہ نقطۂ کمال ہے جو قدرت اس دنیا پر اب تک منکشف کر سکی اور یہی وہ نور ہے جو اس اُمّی سید عربیؐ کے ذریعے انسان کی ظلمتِ روحانی دور کرنے کے لئے ظاہر ہوا تھا ۔ حیاتِ سرمد کے اُس مہرِ منور کو جو ظلمت کدۂ موت میں طلوع ہوا تھا آنحضرتؐ نے "وحی" اور "فرشتہ جبریل" کے نام سے موسوم کیا ۔ کیا آج بھی کوئی بتا سکتا ہے کہ اُسے اور کس لفظ سے تعبیر کرنا چاہیئے ؟ ہماری عقل القائے ربّانی کا ایک پرتو ہے ۔ حقائق کو جاننا اور اشیا کی ماہیت پہچاننا ایک ایسا وجدانی فعل ہے جس کی توضیح بہترین منطق بھی نہیں کر سکتی ۔ نوالس[1] کا قول ہے کہ "کیا ایمان بالغیب وجودِ باری تعالیٰ کو بہترین طور پر ثابت نہیں کرتا ؟" آنحضرتؐ کی روح کے لئے جو اس حقیقتِ کبریٰ سے معمور تھی ، یہ بالکل فطری امر تھا کہ وہ اس کو اور صرف اسی کو دنیا کی ایک اہم چیز تصوّر کرتی ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظلمت و ہلاکت سے بچا کر اس حقیقتِ عظمیٰ کے

---

[1] نوالس (۱۷۷۲ء ۔ ۱۸۰۱ء) جرمن کا ممتاز شاعر اور ناولسٹ ۔

انکشاف سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس لئے آپ کا یہ فرض تھا کہ اس پیغام کو ساری مخلوق تک پہنچائیں۔

"محمد الرسول اللہ" کے یہی معنی ہیں اور اس لحاظ سے کلمے کا یہ جزو بھی بالکل صحیح ہے۔

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ خوش صفات خدیجہؓ نے آپ کے اس بیان کو تعجب اور شک کے ساتھ سنا ہو گا۔ لیکن بالآخر انھوں نے جواب دیا:

"جو کچھ آپ نے فرمایا بالکل صحیح ہے"

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ اس جواب سے حضرت خدیجہؓ کے کس قدر ممنون ہوئے ہوں گے اور ان کے تمام احسانات میں اس مخلصانہ کلام کے تسلیم کر لینے کو کیا درجہ دیا ہو گا۔ نوالس کا قول ہے کہ "جس لمحے میرے عقیدے کو کوئی اور شخص تسلیم کرتا ہے، وہ بے انتہا مستحکم ہو جاتا ہے۔" کوئی شبہ نہیں کہ عنایت و مہربانی کا یہ انتہائی درجہ ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ آخر عمر تک حضرت خدیجہؓ کو نہیں بھول سکے۔ اس واقعے کے بہت عرصے بعد ایک دفعہ آپؐ کی کمسن اور محبوب بیوی عائشہؓ نے (جو اپنی مختلف خصوصیات کے باعث عالم اسلام میں بہت ممتاز ہیں) آپؐ سے پوچھا کہ "کیا میں خدیجہ سے بہتر نہیں ہوں؟ وہ تو بیوہ، بوڑھی اور بدصورت ہو گئی تھیں۔ کیا آپ مجھے ان سے زیادہ نہیں چاہتے؟" آنحضرتؐ نے فرمایا:

"قسم ہے رب العالمین کی، میں ان کو تم سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ وہ مجھ پر اُس وقت ایمان لائیں جب کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ ساری دنیا میں میرا صرف ایک دوست تھا اور وہ خدیجہؓ تھیں۔" حضرت خدیجہؓ کے علاوہ آپؐ کے چچا زاد بھائی علیؓ ابن طالب اور آپؐ کے غلام زید پہلے مسلمان ہیں۔

آنحضرتؐ نے اپنے عقائد کا مختلف لوگوں پر اظہار کیا۔ لیکن اکثر نے اُسے بے اعتنائی اور تمسخر کے ساتھ سنا اور تین سال کی مدت میں میں سمجھتا ہوں کہ شاید آپؐ صرف تیرہ آدمیوں کو مسلمان کر سکے۔ آپ کی ترقی کی رفتار بہت سست تھی اور آپ کے ساتھ بھی ایسا سلوک ہوا جیسا کہ عموماً ایسی صورتوں میں ایسی ہستیوں (انبیاء) کے ساتھ ہوتا ہے۔ تین سال کی معمولی کامیابی کے بعد ایک دفعہ آپ نے اپنے اقربا میں سے چالیس آدمیوں کو مدعو کیا اور ان کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے عقائد کا اظہار فرمایا اور کہا کہ "مجھے اس پیغام کو ساری نوع انسان تک پہنچانا ہے۔ یہ دنیا کی اعلیٰ ترین بلکہ یکتا نعمت ہے۔ آپ لوگوں میں سے کون میرا ساتھ دے گا؟" اس ساکت اور رشک بھرے مجمع میں سے صرف ایک حضرت علیؓ (جن کی عمر سولہ سال کی تھی) خموشی کو برداشت نہ کر سکے اور کھڑے ہو کر پُرجوش لہجہ میں بولے: "میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" یہ مجلس

(جس میں حضرت علیؓ کے والد ابوطالب بھی شامل تھے) گو آنحضرتؐ کے خلاف نہ تھی لیکن صرف دو آدمیوں کا ساری نوع انسان کے خلاف اس مہم کا فیصلہ کرنا اُسے مضحکہ خیز معلوم ہوا اور تمام اہلِ محفل قہقہے لگاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن زمانے نے چل کر ثابت کر دیا کہ یہ ہنسی کے قابل بات نہ تھی بلکہ نہایت اہم معاملہ تھا۔

حضرت علیؓ کے صفات تو ایسے ہیں کہ ان پر بے اختیار محبت آتی ہے۔ انھوں نے ہر موقع پر خود کو نہایت شریف النفس، محبت آشنا اور جری ثابت کیا ہے۔ ان میں ایک عجیب طرح کی شجاعت پائی جاتی ہے اور شیر کی سی دلیری کے باوجود مروت، صداقت اور محبت کا ایسا جلوہ نظر آتا ہے جو مسیحی نائٹ کے شایاں ہے۔ آپ نے اپنی انتہائی نیکی کی وجہ سے دوسروں کی نیکی پر اعتبار کیا اور اسی کے باعث بغدادؔ[1] کی ایک مسجد میں شہید ہوئے۔ شہادت سے پہلے آپ نے فرمایا کہ" اگر زخم مہلک ثابت نہ ہو تو قاتل کو معاف کر دینا ورنہ اس سے فوراً قصاص لینا تاکہ ہم دونوں

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ تقریر کی رو میں کارلائل بجائے کوفہ کے بغداد گیا کیونکہ حضرت علیؓ کی شہادت کوفہ میں واقع ہوئی اور بغداد اس واقعہ کے تقریباً ایک صدی بعد خلیفہ منصور عباسی کے عہد میں آباد ہوا۔

ایک ہی وقت دربار رب العزت میں حاضر ہوں اور وہاں اس کا فیصلہ ہو جائے کہ ہم میں سے کون برسرِ حق تھا"۔

آنحضرتؐ کی تبلیغ قدرتاً قریش کو ناگوار گزری جو کعبہ کے پاسبان اور بتوں کے متولی تھے۔ دو ایک ذی اثر آدمی اسلام لے آئے تھے۔ اسلام گو آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا لیکن اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا تھا جس سے ہر شخص ناراض ہو رہا تھا اور کہتا تھا کہ "یہ کون ہیں جو آپ کو ہم سب سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ ہمیں احمق اور ہمارے بتوں کو لکڑی کے کھلونے ٹھہراتے ہیں"۔ آخر آپؐ کے خوش صفات چچا ابو طالب نے آپ سے کہا: "جانِ عم! کیا تم اس تبلیغ سے باز نہیں آسکتے؟ اپنی حد تک اس عقیدے کے پابند رہو لیکن اس کا چرچا کر کے دوسروں کو پریشان کرنے، سردارانِ قبائل کو ناراض کرنے اور ہمیں خود اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے سے کیا حاصل؟"

آنحضرتؐ نے یہ سن کر جواب دیا کہ "اگر میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند آکر اس تبلیغ سے باز رہنے کی خواہش کرے تو بھی میں اس کی تعمیل نہیں کر سکتا[1]"۔

---

[1] آنحضرتؐ کا یہ ارشاد چونکہ کارلائل نے کسی ترجمہ سے نقل کیا ہے اس لئے اس کے اصلی مفہوم میں (باقی اگلے صفحہ پر)

اس پیغامِ صداقت میں، جو آپ لے کر آئے تھے، ایک ایسا فطری عنصر شامل تھا جو درجے میں آفتاب، ماہتاب غرض فطرت کی کسی صنعت سے کم نہ تھا۔ یہ عنصر مہ وخورشید اور تمام انسانوں اور اشیا کی مخالفت کے باوجود اُس وقت تک اپنا اظہار کرتا رہے گا جب تک اُسے خدائے تعالیٰ کا حکم ہو۔ وہ اس پر مجبور تھا جس کے سوا اُسے کوئی چارہ نہ تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ یہ جواب دے کر رونے لگے کیونکہ آپؐ سمجھتے تھے کہ ابوطالب کو آپؐ کے ساتھ محبت ہے اور یہ خدمت جو آپؐ کے تفویض ہوئی کوئی آسان نہیں بلکہ نہایت دشوار اور عظیم الشان تھی۔

بقیہ صفحہ ۵۴

غلطی ہوگئی ہے۔ آنحضرتؐ نے یہ فرمایا تھا کہ "اگر لوگ آفتاب کو میرے دائیں ہاتھ میں اور ماہتاب کو میرے بائیں ہاتھ میں رکھ دیں تب بھی میں اس تبلیغ سے باز نہیں آسکتا۔" آپؐ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

يَا عَمِّ وَاللّٰهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِيْ وَالْقَمَرَ فِيْ يَسَارِيْ عَلٰى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ اَوْ اَهْلِكَ فِيْهِ مَا تَرَكْتُهُ۔

(ابن ہشام صفحہ ۱۶۷)

بعض محدثین اس حدیث کی یہ تعبیر کرتے ہیں کہ آفتاب سے آپ کی مراد تکلیف اور ماہتاب سے راحت تھی یعنی "کفار خواہ مجھے دنیا کی تمام تکلیفیں پہنچائیں یا راحتیں میں کسی طرح اس تبلیغ سے باز نہیں آسکتا۔

غرض جو شخص آپ کی طرف متوجہ ہوتا، آپؐ اُس سے اسی کے متعلق گفتگو کرتے اور جو زائرین مکہ آتے اُن پر اپنے عقائد کا اظہار فرماتے۔ اس طرح آپؐ کے معتقدین کی تعداد میں تدریجی اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ آپؐ سے کفار کا باہم اختلاف، تنفر اور خطرات بھی بڑھتے گئے۔ آپؐ کے ذی اقتدار اعزّہ نے اگرچہ پہلے پہل آپؐ کی حمایت کی لیکن رفتہ رفتہ خود آپؐ ہی کے ایما سے تمام مسلمانوں کو مکہ چھوڑ کر سمندر پار حبش میں پناہ لینی پڑی۔ قریش کی برہمی بڑھتی گئی اور انھوں نے آپؐ کو قتل کرنے کے لئے حلف اٹھایا اور منصوبے باندھے۔ ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اگرچہ آنحضرتؐ ہماری ہمدردی کے محتاج نہیں، لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس زمانے میں آپؐ کی حالت نہایت دردناک تھی۔ آپ کو غاروں میں چھپنا پڑا، بھیس بدل کر رہنا پڑا، بے خانماں پھرنا پڑا، اس کے باوجود ہمیشہ جان کا خطرہ لگا رہا۔ بعض دفعہ آپ کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی بعض دفعہ آپؐ بال بال بچے۔ کبھی تو آپؐ کے دشمن کا گھوڑا ابھڑک گیا۔ کبھی ایسا ہی کوئی اور واقعہ پیش آگیا۔ ورنہ آپؐ اور آپؐ کی تعلیمات وہیں ختم ہو جاتیں اور دنیا کو اس کی خبر کبھی نہ ہوتی۔ لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو اُس کا اس طرح ختم کر دینا منظور نہ تھا۔

نبوّت کا تیرہواں سال تھا کہ آخر آپؐ کے اعدا نے ہر قبیلے سے ایک

ایک شخص منتخب کر کے چالیس آدمیوں کی ایک جماعت تیار کی جس نے آپؐ کے قتل کا عہد و پیمان کر لیا۔ یہ حال دیکھ کر آپؐ نے یثرب کا قصد فرمایا جہاں کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے یہ مقام اب مدینہ یا مدینۃ النبیؐ کہلاتا ہے۔ مکہ سے اس کا فاصلہ دو سو میل ہے اور راستے میں تمام تر کوہ و بیابان واقع ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی طبیعت کا اُس وقت کیا عالم ہو گا۔ اسی حالت میں بہزار دقت و دشواری آپ مدینہ پہنچے جہاں آپ کا پُرجوش استقبال ہوا۔ مشرقی سنہ کا آغاز اسی واقعہ سے ہوتا ہے۔ پہلا سن ہجری ۶۲۲ عیسوی کے مطابق ہے۔ اُس وقت آنحضرتؐ کی عمر ترپن ۵۳ سال کی تھی۔ آپؐ بوڑھے ہو چکے تھے۔ اور آپؐ کے احباب ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ آپؐ کا راستہ سنسان اور پُرخطر تھا اور بجز اس کے کہ خود آپؐ کا دل نور امید سے روشن ہو، ظاہری صورت حال نہایت تاریک تھی۔ ایسی صورتوں میں سب آدمیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

اب تک آنحضرتؐ نے صرف ترغیب و تلقین کے ذریعے اپنے مذہب کی اشاعت فرمائی تھی۔ لیکن جب ستم شعار اعدا نے آپؐ کو بے رحمی کے ساتھ وطن سے نکال دیا اور نہ صرف اس پیغام ایزدی کی طرف سے بے اعتنائی کی بلکہ آپؐ کی جان کے بھی درپے ہوئے تو مادر صحرا کے اُس پُرجوش فرزند نے اس طرح اپنی مدافعت کا تہیہ کیا جو ایک انسان اور ایک

عرب کے شایان تھا۔ اس نے کہا کہ "اگر قریش اسی پر تلے ہوئے ہیں تو یہی سہی۔ یہ لوگ اُس پیغام کو نہیں سُنتے جو اُن کے اور تمام نوعِ انسان کے لئے بے انتہا اہم ہے اور چاہتے ہیں کہ اُسے جبر و تشدّد اور قتل و غارت کے ذریعے دبا دیں۔ اچھا! تو انھیں شمشیر آزمائی بھی کر لینے دو۔" اس کے بعد آنحضرتؐ کو دس سال اور ملے جو سخت جنگ و جدل اور جدوجہد میں صرف ہوئے۔ اس شدید کشمکش کا جو نتیجہ نکلا وہ آج ہمارے پیشِ نظر ہے۔

اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلنے کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مذہب عیسوی کے پیروؤں کے لئے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ وہ نہایت امن و سکون کے ساتھ صرف تعلیم و تلقین کے ذریعے پھیلا۔ لیکن اگر ہم کسی مذہب کی صداقت کا معیار اسی کو قرار دے لیں تو یہ ایک بنیادی غلطی ہوگی۔ تلوار بے شک استعمال ہوئی مگر سوال یہ ہے کہ یہ تلوار آئی کہاں سے؟ ہر نیا خیال ابتداً ایک ہی شخص کے دماغ میں پیدا ہوتا اور اسی میں جاگزیں رہتا ہے۔ ساری دنیا میں صرف ایک انسان اپنے تمام ابنائے جنس کے خلاف اس کا پابند ہوتا ہے۔ اگر وہ اکیلا تلوار لے کر اس خیال کی اشاعت کرنا چاہے تو شاید ہی کچھ حاصل ہو۔ اس لئے پہلے تو اُسے تلواریں بہم پہنچانی پڑیں گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خیال خود بخود وسعت اختیار کرتا جاتا ہے۔ مذہب عیسوی کا دامن بھی ہمیں

انسانی خون کے دھبّوں سے پاک نہیں نظر آتا۔ جب اُس کے ہاتھ میں تلوار آئی تو اُس نے کبھی اس کا استعمال کیا ہے۔ شارلیمین[1] کے عہد میں سکسینوں کا تبدیل مذہب کبھی تبلیغ کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس لئے زور شمشیر کا اعتراض میری رائے میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ میرے نزدیک اس دنیا میں ہر شے کو جدوجہد کا حق حاصل ہے، خواہ وہ زبان سے ہو یا تلوار سے یا کسی اور ایسے ذریعے سے جو اُسے میسر آجائے۔ وہ ہر چند تبلیغ و تلقین کرے، لڑے جھگڑے اور ایڑی چوٹی کا زور لگائے لیکن انجام کار کسی ایسی چیز پر غالب نہ آسکے گی جو مغلوب ہونے کی مستحق نہ ہو۔ جو چیز اس سے بہتر ہے وہ اُسے ہرگز زیر نہیں کر سکتی۔ البتہ جو چیز اس سے بدتر ہے اُس پر وہ ضرور قابو پالے گی۔ اس مبارزت عظمیٰ میں خود قدرت ثالث ہے جو کبھی غلطی نہیں کرسکتی اور آخرکار وہی شے فروغ پائے گی جو سب سے زیادہ مطابق فطرت ہے اور جسے ہم عام طور پر ”صادق ترین“ کہتے ہیں۔

حضرت محمدؐ اور ان کی کامیابی کے سلسلے میں یہ ذہن نشین رہے

---

[1] شارلیمین (۷۴۲ء - ۸۱۴ء) شہنشاہ فرانس جس نے جرمن کے باشندوں کو عیسائی کرنے کے لئے تین سال تک ان کے خلاف جنگ کی ان کے کئی شہروں کو تباہ و برباد کیا اور ان کے ملک میں خون کی ندیاں بہا دیں۔

کہ قدرت ایسی اعلیٰ ثالث ہے، جس کی بزرگی حلم اور تحمل کی کوئی حد نہیں۔ مثال کے لئے آپ تھوڑے سے گیہوں لے کر زمین میں ڈال دیجئے۔ یہ گیہوں مٹی، بھوسی، گھاس، خاک، غرض دنیا بھر کے آخور میں مل جائیں، کوئی ہرج نہیں۔ آپ نے چونکہ انھیں حق پسند اور مہربان زمین کے سپرد کیا ہے، وہ اس سارے آخور کو خوشی کے ساتھ جذب کر لیتی ہے اور گیہوں کی بالیاں نمایاں کر دیتی ہے۔ وہ اس تمام خس و خاشاک کے متعلق کچھ نہیں کہتی بلکہ اُسے بھی کسی نہ کسی کام میں لے آتی ہے اور گیہوں کی لہلہاتی بالیاں چھوڑ جاتی ہے۔ مادرِ فطرت کا ہر جگہ یہی حال ہے۔ وہ صادق ہے اور اپنی صداقت کے اظہار میں بزرگی، انصاف اور مادرانہ شفقت سے کام لیتی ہے۔ ہر چیز میں وہ اصلیت کو ڈھونڈتی ہے۔ اگر وہ اصلی ہوئی تو اس کی حفاظت کرتی ہے۔ ورنہ نہیں۔ اب تک جتنی چیزوں کی اس نے حفاظت کی، ان سب میں صداقت کی ایک روح پائی جاتی ہے۔

افسوس! اعلیٰ ترین حقائق جو اب تک ظہور میں آئے ان سب کا قالب نامکمل رہا۔ یعنی ایک عنصرِ لطیف قالب کثیف میں ظاہر ہوا، کیونکہ ہماری نگاہوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ حقائق خالص منطقی پیرایہ میں نمودار ہوں اور نرے سائنٹفک دلائل سے ثابت کئے جائیں جو کبھی نامکمل نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک نہ ایک دن نامکمل اور غلط ثابت ہو کر فنا

ہو جاتے ہیں۔ اس طرح گو تمام حقائق کا قالب ایک دن مٹ جاتا ہے، لیکن ان سب میں ایک روح ہوتی ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی بلکہ خود انسان کی طرح ہمیشہ ایک نئے اور بہتر لباس میں غیر فانی رہتی ہے۔ یہ خاصۂ فطرت ہے کہ وہ صداقت کی اصلی روح کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتی۔ البتہ اس کا معیار انتخاب یہی ہے کہ وہ اصلی ہو، فطرت کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ایک آواز ہو۔ ہم جسے اچھا یا برا کہتے ہیں، وہ اس کے نزدیک اصل سوال نہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ تم میں کس قدر آلائش ہے بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ تم میں کچھ جوہر بھی موجود ہیں یا نہیں۔ اچھے تو بہت لوگ کہے جا سکتے ہیں۔ ہم آپ بھی اچھے، بہت اچھے ہیں۔ لیکن ہم میں اصلیت اور صداقت نہیں بلکہ نمود و نمائش، تصنع اور بناوٹ ہے۔ ہم قلب کائنات سے ہمیشہ ناآشنا رہے۔ صحیح معنوں میں ہم پر نہ نیک کا اطلاق ہو سکتا ہے، نہ بد کا۔ ہم ہیچ ہیں۔ فطرت کو ہم سے کوئی سروکار نہیں۔

اسلام کو ہم نے ایک طرح کی عیسائیت سے تعبیر کیا ہے اور فی الحقیقت جس والہانہ گرمجوشی سے لوگوں نے اُسے قبول کیا اس پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن مہمل شامی فرقوں سے بہتر تھا جو صرف اس مسئلے کے متعلق برسر پیکار رہتے کہ آیا اقانیم ثلاثہ ہم جوہر ہیں یا صرف باپ بیٹے (یعنی خدا اور مسیح) ہم جوہر ہیں اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دماغ

تو لایعنی شور و غل سے معمور ہو گیا، لیکن دل بالکل منجمد اور معتّر رہا۔

اسلام کی صداقت بھی بعض غلط اور باطل عقائد میں لپٹ گئی ہے۔ لیکن اس پر اس کی صداقت کی وجہ سے ایمان لایا جاتا ہے نہ کہ اس باطل کی آمیزش کی وجہ سے۔ اسلام محض ایک بے جان منطقی گورکھ دھندا نہیں۔ مادرِ صحرا کے اس امّی فرزند (آنحضرتؐ) نے اپنے پُر خلوص اور روشن ضمیر کے ذریعے (جو موت و حیات کی طرح صداقت سے معمور تھا) اور اپنی نگاہ حقیقت آشنا کی بدولت جو بالکل خداداد تھی) عربوں کی لایعنی بت پرستی، یونانیوں اور یہودیوں کے مذہبی مناظرات، قدیم روایات، رسم و رواج اور فضول کج بحثیوں میں سے اصل حقیقت کو پالیا اور فرمایا کہ "بت پرستی فعلِ عبث ہے۔ ان لکڑی کے بتوں کو تم لوگ تیل اور موم لگاتے ہو اور انھیں مکھیاں چمٹتی ہیں۔ یہ لکڑی کے ٹکڑے ہیں۔ تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ لوچ اور مہمل شرک اور کفر ہے۔ اگر تم ان کی حقیقت سمجھو تو ان کا وجود دہشت خیز اور نفرت انگیز ہو جائے۔ بقا صرف خدا کی ذات کو ہے۔ قوت و اقتدار اسی کو حاصل ہے۔ اس نے ہم کو پیدا کیا۔ وہی ہم کو مار اور جلا سکتا ہے۔ اللہ اکبر! اللہ بہت بڑا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تمہارے حق میں وہی بہتر ہے جو وہ چاہے خواہ تمہارے نفس کو کتنا ہی گراں گزرے لیکن تم اسی کو بہترین پاؤ گے۔ تم اس

کے اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ دنیا اور عقبیٰ میں تمہارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں "۔

اگر وحشی بت پرستوں نے آپؐ کے پیغام کو قبول کرلیا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے اسے اپنے حرارت بھرے سینوں میں جگہ دی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔میرے نزدیک وہ اسی طرح قبول کئے جانے کے قابل تھا۔کسی نہ کسی صورت میں آج بھی یہی ایک پیغام ہے جسے ہر شخص کو قبول کرنا چاہیئے۔ اس سے انسان اس معبد عالم کا سرنشین بن جاتا ہے ، خالق جہاں کے احکام کا ہمصفیر ہو جاتا ہے اور ان احکام کی احمقانہ مخالفت کے بجائے ان کے ساتھ اشتراک عمل کرنے لگتا ہے ۔ آج تک مجھے فرض شناسی کی اس سے بہتر تعریف نہ معلوم ہوسکی ۔مقصد کائنات کا ساتھ دینے میں تمام محاسن شامل ہیں۔اس سے انسان کو نیکی اور کامیابی حاصل ہوتی ہے (کیونکہ مقصد کائنات کا کامیاب ہونا ضروری ہے) اور وہ صراط مستقیم پر رہتا ہے۔عقیدۂ تثلیث میں ذات وصفات کی فضول بحثیں جس شد ومد سے چاہیں جاری رہیں ، لیکن ان سب کا اگر کوئی مدعا ہوسکتا ہے تو یہی ہے ۔اگر وہ اس منشا کے ظاہر کرنے میں کامیاب نہ ہوں تو مہمل ہیں ۔غور طلب امر یہ نہیں کہ ان نظریوں اور منطقی مسئلوں کو صحیح طور پر الفاظ کا جامہ پہنایا گیا یا غلط طور پر، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ بنی آدم انھیں اپنے دل

میں جگہ دینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں - اسلام نے ان تمام مہمل مذہبی فرقوں کو مٹا دیا اور میری رائے میں اُس کو اس کا حق حاصل تھا - وہ سراپا حقیقت تھا جو خاص سینۂ فطرت سے از سرِ نو نمودار ہوا - عربوں کی بُت پرستی، شامیوں کے عقائد' غرض ہر اس مذہب کو جو اس طرح صداقت پر مبنی نہ تھا' اس کے آگے جھک جانا پڑا - یہ مذاہب کئی اعتبار سے محض سوکھی لکڑی تھے جنھیں اسلام کی آتشِ صداقت نے جلا دیا -

اسی جنگ و جدل اور جدوجہد کے زمانے میں خصوصاً ہجرت کے بعد آنحضرتؐ نے وہ مقدس کتاب لکھوانی شروع کی جو قرآن کہلاتی ہے - یہی وہ کارنامہ ہے جسے آپ اور آپ کے اصحاب نے بڑی اہمیت دی اور ساری دنیا کے سامنے معجزے کی حیثیت سے پیش کیا - مسلمان قرآن کی اس قدر تعظیم کرتے ہیں کہ شاید ہی کوئی عیسائی اتنی انجیل کی کرتا ہو - یہ ہر جگہ تمام قوانین و اعمال کا معیار قرار دیا گیا ہے اور خیال و عمل کے لئے چراغِ ہدایت سمجھا گیا ہے - یہ خدا کا وہ خاص پیغام مانا جاتا ہے جس پر ساری دنیا کو عمل پیرا ہونا چاہیئے - اسلامی عدالتیں اس کی رو سے فیصلے صادر کرتی ہیں - ہر مسلمان اس کی تعلیم حاصل کرنا اور اُسے اپنا مقصدِ زندگی بنانا فرض سمجھتا ہے - مسجدوں میں روزانہ اس

کی تلاوت کی جاتی ہے۔ تیس تیس مولویوں کی ایک جماعت یکے بعد دیگرے روز اس کا ورد کرتی ہے۔ آج بارہ سو برس سے ہر وقت اس صحیفۂ گرامی کی آواز کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ میں گونج رہی ہے۔ بعض ایسے علمائے اسلام کا حال سُننے میں آیا جنھوں نے اپنی عمر میں اس کے ستر ہزار ورد کئے ہیں۔

یہ چنداں تعجب خیز نہیں کہ عرب اُسے اس قدر عزیز کیوں رکھتے تھے۔ ایک دفعہ آپ قرآن کے ان اوراق پریشاں کو دور رکھ دیجئے۔ خود بخود اس کی روح رواں آپ پر منکشف ہونے لگے گی اور یہ اس کی ادبی لطافت نہیں بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ دل سے جو بات نکلتی ہے وہ خود بخود دوسروں کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے، جس کے مقابلے میں تمام صنعت و معنی آفرینی کوئی حقیقت نہیں۔ قرآن کی پہلی خصوصیت اُس کی اصلیت و صداقت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پریڈو[1] وغیرہ اُسے "فریب کاریوں کا ایسا مجموعہ" بتاتے ہیں" جس میں شروع سے آخر تک اُس کے مصنف کی پیہم خطاؤں کی توجیہہ و تاویل اور اس کی آرزوؤں کی وکالت کی گئی ہے"۔ لیکن درحقیقت اب وہ وقت آپہنچا ہے کہ ایسی مہمل باتیں چھوڑ دی جائیں۔

---

[1] ہمفری پریڈو (۱۶۴۸ء - ۱۷۲۴ء) یہ نہایت متعصب پادری تھا۔

میرے نزدیک یہ اتہام لگانا کہ " وہ اکثر یا کبھی جان بوجھ کر مکر و فریب کرتے تھے " بالکل صحیح نہیں ، چہ جائیکہ یہ کہنا کہ " مکر و فریب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور انھوں نے محض بازیگری کے طور پر قرآن پیش کیا "۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر غیر متعصب شخص قرآن کو بالکل دوسری نظر سے دیکھے گا۔

میری رائے میں خلوص اپنے وسیع ترین معنوں میں قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور اسی وجہ سے عرب اُسے اس قدر عزیز رکھتے تھے ۔ یہ اُس کتاب کی پہلی اور آخری خوبی ہے جس میں ہر قسم کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو یہی وہ خصوصیت ہے جس سے کسی طرح کی خوبی پیدا ہو سکتی ہے ۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ قرآن میں اصلی اور حقیقی بصیرت کی ایک ایسی جھلک نظر آتی ہے جسے شاعرانہ لطافت سے تعبیر کرنا بے جا نہ ہوگا ۔ اس کا بیشتر حصہ محض روایات پر مبنی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے گویا نہایت دلسوزی اور سرگرمی کے ساتھ فی البدیہہ تعلیم و تلقین کی گئی ہے ۔ اس میں بار بار گزشتہ پیغمبروں کے وہ حالات بیان کئے گئے ہیں جو عرب میں مشہور تھے ۔ مثلاً یہ کہ مختلف قوموں کی ہدایت کے لئے ابراہیمؑ ، ہودؑ ، موسیٰؑ وغیرہ مختلف پیغمبر یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے جن کے ساتھ ان کی قوم نے ایسا ہی سلوک کیا جیسا کہ آنحضرتؐ کے ساتھ آپؐ کی قوم نے ۔ جو بڑی حد تک آپ کی

تسلی کا باعث ہوا۔ گو قرآن کا جزو اعظم یہی ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس میں اکثر ایسے تجلیات بھی ملتے ہیں جو ایک حقیقی مفکرِ و مبصر کے شایان ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ اس کائنات کی حقیقت سے واقف تھے، اسی لئے آپؐ صاف و سلیس پیرائے میں ہمارے قلب کو بھی اس رمز سے آشنا کر دیتے ہیں جس سے آپ کا ضمیر پاک و روشن تھا۔ آپؐ نے خدائے تعالیٰ کی جو تعریفیں کی ہیں، اکثر لوگ ان کے بہت مداح ہیں۔ لیکن میں انھیں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ میرے خیال میں وہ زیادہ تر عبرانی سے ماخوذ ہیں۔ یہ نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ عبرانی میں خدا کی تعریفیں اس سے بہتر پیرائے میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ میں جس چیز کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں وہ ان کی نگاہ حقیقت آشنا ہے، جو قلبِ اشیا تک جا پہنچتی ہے اور ان کی کُنہ سے واقف ہو جاتی ہے۔ یہ قدرت کا وہ عطیۂ خاص ہے جو وہ تمام انسانوں کو عطا کرتی ہے لیکن جس کی ہزروں میں ایک آدھ ہی قدر کرتا ہے۔ اسی کو میں صحتِ نظر سے تعبیر کرتا ہوں اور یہی میرے نزدیک قلبِ صادق کی پہچان ہے۔

آنحضرتؐ سے معجزات ظہور میں نہیں آئے اور آپ نے اکثر بلا تامل کہہ دیا کہ "میں معجزے نہیں کرتا۔ میں ہادئ خلق ہوں اور میرا کام ان عقائد کو تمام مخلوق تک پہنچانا ہے۔" اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ

ابتدا سے آپ کے نزدیک یہ کائنات ایک معجزۂ عظیم رہی ۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ " اس دنیا کو دیکھو! کیا وہ دستِ قدرت کی عجیب و غریب صنعت نہیں ہے ؟ یہ ایک نشانی ہے تمھارے لئے اگر تم دیدۂ بینا رکھتے ہو۔ یہ زمین خدا نے تمھارے لئے پیدا کی اور اس پر راستے بنا دیئے۔ تم اس پر رہ سکتے ہو اور چل پھر سکتے ہو"۔ عرب کے گرم ملک میں بادلوں کا وجود آنحضرتؐ کے لئے حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں کہ " بادلوں کے پرے جو سینۂ فلک کی گہرائی سے نکلتے ہیں، آخر کہاں سے آتے ہیں؟ سیاہ ابر کے یہ دل کے دل آسمان پر جمع ہوتے اور برستے ہیں، جن سے مردہ زمین جی اٹھتی ہے، سبزہ لہلہانے لگتا ہے اور کھجوروں سے لدے ہوئے بلند سایہ دار درخت پیدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ ایک معجزہ نہیں ہے؟ تمھارے مویشی بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیئے جو تمھاری خدمت کرتے اور تمھارے لئے غذا اور لباس بہم پہنچاتے ہیں۔ وہ شام کے وقت قطار در قطار گھروں کی طرف لوٹتے ہیں۔ اور تمھارے لئے نعمت ہیں۔" آپ نے اکثر جہازوں کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: " وہ بڑے متحرک پہاڑ اپنے کپڑوں کے پر پھیلا کر سرعت کے ساتھ پانی پر چلتے ہیں۔ آسمانی ہوائیں انھیں چلاتی ہیں اور جب کبھی خدائے تعالیٰ ہوا بند کر دیتا ہے، وہ رک جاتے ہیں اور حرکت نہیں کر سکتے"۔

معجزات! آپ [illegible] لوگ [illegible] معجزات دیکھنا چاہتے

ہو؟ کیا تمہارا وجود ایک معجزہ نہیں ہے؟ خدا نے تمہیں تھوڑی سی مٹی سے پیدا کیا۔ اس سے پہلے تمہارا وجود بھی نہ تھا۔ پھر جب تم پیدا ہوئے تو بہت چھوٹے سے تھے۔ اس کے بعد تم میں حسن آیا، طاقت آئی اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ مگر پھر ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ تم بوڑھے ہو جاتے ہو۔ تمہارے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ تمہاری طاقت جواب دینے لگتی ہے۔ اور آخر کار تم فنا ہو جاتے ہو۔" خصوصاً آپ کا یہ جملہ مجھے بہت پسند آیا کہ "خدائے تعالیٰ نے تم میں ہمدردی کا مادہ پیدا کیا۔ اگر یہ نہ پیدا کرتا تو تم لوگوں کا کیا حال ہوتا؟" یہ ایک نہایت اعلیٰ اور اچھوتا خیال ہے۔ حقیقتِ اشیا کی ایک نادر جھلک ہے۔ آپ کی طبیعت میں شاعرانہ کمال اور بہترین و صادق ترین خیالات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آپ ایسی اعلیٰ ذہانت، بصیرت اور دل و دماغ کے مالک تھے کہ شاعر، بادشاہ، مذہبی پیشوا، غرض جس قسم کے مشہور انسان بننا چاہتے بن سکتے تھے۔

آپ پر ہمیشہ یہ بات عیاں رہی کہ یہ کائنات سراپا ایک معجزہ ہے جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا۔ اسکینڈے نیویا کے باشندوں اور دوسرے مفکرین کی طرح آپ کی بھی یہ رائے ہے کہ یہ عالم جو بظاہر بالکل حقیقی اور مادی دکھائی دیتا ہے، دراصل ذات باری تعالیٰ کے وجود

اور قدرت کا صرف ایک مرئی اور محسوس مظہر ہے ۔ فضا کے سینۂ عریاں پر ذاتِ الٰہی کا ایک پرتو ہے اور بس ۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ " یہ بڑے بڑے پہاڑ ایک دن بادلوں کی طرح پھٹ کر آسمان میں غائب ہو جائیں گے "۔ سیل لکھتا ہے کہ " عربوں کے عقیدے کے مطابق آپ نے زمین کو چوڑی چکلی ظاہر کیا ہے جس کے مستحکم کرنے کے لئے پہاڑ قائم ہیں ۔ قیامت کے دن یہ پہاڑ بادلوں کی طرح اُڑ جائیں گے اور زمین اس قدر گھومے گی کہ تباہ ہو کر گرد و غبار کی طرح خلا میں غائب ہو جائے گی ۔ خدائے تعالیٰ اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لے گا اور وہ فنا ہو جائے گی "۔

آنحضرتؐ پر خدائے تعالیٰ کا عالمگیر اقتدار ہر وقت عیاں تھا ۔ یعنی آپؐ بخوبی سمجھتے تھے کہ دنیا کی تمام اشیا کی اصلی طاقت ۔ روح اور حقیقت کی حیثیت سے ہر جگہ ایک ایسی ناقابل بیان قوت ، عظمت اور جبروت موجود ہے جس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا ۔ یہی چیز عہدِ حاضر میں قوانینِ قدرت اور نوامیس فطرت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اور کوئی آسمانی شے نہیں سمجھی جاتی بلکہ سرے سے ایک شے ہی نہیں سمجھی جاتی ۔ وہ اشیا کا ایک ایسا مجموعہ تصور کی جاتی ہے جو صفاتِ ایزدی سے معرّا ، قابل بیع و شریٰ اور ہیچ کارہ ہو ۔ موجودہ علوم و فنون کے انہماک میں اس کا

احتمال ہے کہ ہم خدا کو بھلا بیٹھیں حالانکہ اس کو نہ بھولنا چاہیئے ۔ کیونکہ اگر وہی بھلا دیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں پھر کون سی چیز یاد رکھنے کے قابل رہے گی ۔ اس صورت میں تمام علوم بالکل مہمل ، مردہ اور بے کار ہو جائیں گے ۔ اعتقاد باریٔ تعالیٰ کے بغیر بہترین علوم بھی چوب خشک ہوں گے نہ کہ درخت سبز جس سے ہر دم نئی لکڑی حاصل ہو سکے ۔ انسان کسی نہ کسی طریقے پر خدا کی پرستش کیئے بغیر کچھ نہیں جان سکتا ۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کا سارا علم و فضل ہیچ ہے ۔

اسلام کی ہوس پرستیوں[۱] کے متعلق آج تک بہت کچھ کہا اور لکھا گیا جو اصلیت سے زیادہ ہے ۔ وہ ہوس پرستیاں جو ہمارے نزدیک جرم ہیں اور جن کی اسلام میں اجازت دی گئی ، آنحضرتؐ کی قائم کی ہوئی نہیں بلکہ مدت دراز سے بلا روک ٹوک عرب میں رائج تھیں ۔ آنحضرتؐ نے انھیں کئی طرح سے محدود و مقید کر دیا ۔ اسلام کوئی آسان مذہب نہیں ۔ اس میں روزہ داری ، طہارت ، سخت اور پیچیدہ مسائل ، دن میں پانچ دفعہ نماز ، شراب سے اجتناب ، غرض ایسے احکام ہیں جن پر نظر کرتے ہوئے

---

[۱] ہوس پرستیوں سے مصنف کی مراد تعداد ازدواج ہے جس کے بارے میں ہم نے اس کتاب کے مقدمے میں تفصیلی بحث کی ہے ۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آسان ہونے کی وجہ سے مقبول ہوا۔ اور ایک اسلام پر کیا منحصر، دنیا میں کوئی مذہب یا مذہبی عقیدہ محض سہل ہونے کی وجہ سے نہیں رائج ہو سکتا۔ یہ کہنا کہ انسان تن آسانی، عیش پرستی، صلہ کی امید یا مے وانگبین کے لالچ سے (خواہ وہ اس عالم میں ہو یا دوسرے عالم میں) اعمال نیک کی طرف مائل ہوتے ہیں، دراصل نسل آدم پر بہتان لگانا ہے۔ ذلیل ترین انسان میں بھی شرافت کا کچھ نہ کچھ جوہر موجود ہوتا ہے۔ ایک غریب سپاہی بھی جو صرف اپنی جان قربان کرنے کے لئے ملازم رکھا جاتا ہے، ایک خاص عزت رکھتا ہے جو اس کی حقیر تنخواہ اور فوجی قواعد و ضوابط سے مختلف ہوتی ہے۔ نسلِ آدم کا ادنیٰ ترین فرد بھی اپنے دل میں جس چیز کی موہوم سی تمنا رکھتا ہے، وہ مے وانگبین کی لذت نہیں بلکہ اعمال صالح کا شوق اور خدا کے ایک نیک بندے کی حیثیت سے جنت میں داخل ہونے کی آرزو ہے۔ آپ اُسے وہاں تک پہنچنے کا راستہ دکھا دیجئے، پھر دیکھئے کہ ایک شست ترین مزدور بھی آسمانِ شہرت پر چمک جاتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کو تن آسانی کے ذریعے نیک کاموں کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے، وہ بنی نوعِ انسان پر سخت ظلم کرتے ہیں۔ مصیبت، ایثارِ شہادت اور موت ہی وہ موجباتِ ترغیب ہیں جن سے قلب انسانی متاثر ہوتا ہے۔

اگراس کی اندرونی شمع حیات روشن کردی جائے تو اس سے ایسا شعلہ پیدا ہوگا جو تمام آلائشوں کو جلادے گا۔ ادنیٰ طبقے میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ مسرت و شادمانی کا رہائے نمایاں کی ترغیب دلانے کے لئے کافی نہیں بلکہ اس سے اعلیٰ تر ذرائع کی ضرورت ہے۔ کسی مذہب کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ انسانوں کی شکم پروری سے نہیں ہوتا بلکہ اُن اعلیٰ جذبات کے اُکسانے سے جو ہر قلبِ انسانی میں خوابیدہ ہیں۔

کہنے کو خواہ کچھ ہی کہا جائے لیکن محمدؐ کے دامن پر کبھی ہوس پرستی کا دھبہ نہیں لگ سکتا۔ سخت غلطی ہوگی اگر ہم آپؐ کو نفس پرست سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ آپؐ ذلیل عیش و عشرت کے نہیں بلکہ کسی طرح کے بھی عیش و عشرت کے عادی تھے۔ آپؐ کا اثاث البیت بہت ہی ادنیٰ قسم کا تھا۔ جو کی روٹی اور پانی آپؐ کی معمولی غذا تھی۔ بعض دفعہ مہینوں آپؐ کے گھر میں چولھا تک نہ سلگتا۔ عرب مورخین بجا فخر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "آپؐ اپنی نعلیں خود درست کرتے اور اپنی عبا پر خود پیوند لگاتے"۔ آپؐ ایک غریب، جفاکش اور تنگ دست انسان تھے جنھیں کسی طرح کی محنت و مشقت سے عار نہ تھا۔ غرض آپؐ کسی حیثیت سے برے نہیں کہے جاسکتے۔ آپؐ میں تمام خواہشاتِ جسمانی سے اعلیٰ تر ایک جذبہ کارفرما تھا ورنہ وہ تند خو عرب، جو تیئیس ۲۳ سال تک کے زیر علم

لڑتے رہے اور جنھیں ہر وقت آپ کے ساتھ نشست و برخاست کا موقع ملا، آپؐ کی اس قدر تعظیم نہ کرتے۔ وہ آتش مزاج لوگ تھے جو ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اُٹھتے اور ہر طرح کا فتنہ و فساد برپا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ ان پر سچی قابلیت اور جرائت کے بغیر کوئی شخص حکمرانی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لوگ آپؐ کو پیغمبر کہتے تھے حالانکہ آپ ان کے روبرو بالکل صاف و سادہ حالت میں بغیر کسی نقاب و حجاب کے کھڑے تھے۔ انھوں نے آپؐ کو عبا سیتے، نعلیں درست کرتے، لڑتے، مشورہ کرتے حکم دیتے، غرض ہر حالت میں دیکھا تھا۔ انھیں اس کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہوگا کہ آپؐ کس قسم کے آدمی تھے۔ اس وقت ہم آپ کو جو چاہیں کہہ لیں لیکن آج تک کسی شہنشاہ نے تاج مرصع پہن کر اس طرح حکومت نہ کی ہوگی جس طرح اس خرقہ پوش شخص نے کی ہے۔ میرے نزدیک اُس کی ذات میں اصلی ہیرو کی وہ تمام صفات موجود تھیں جو اُسے تئیس سال کی سخت اور حقیقی آزمائش میں کامیاب کرانے کے لئے ضروری تھیں۔

آخری الفاظ جو آنحضرتؐ کی زبان سے نکلے ایک دعا ہے۔ ایک قلبِ مضطر کے اپنے خالق کی بارگاہ میں چند ٹوٹے پھوٹے جملے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مذہبِ اسلام کی اشاعت نے آپؐ کی طبیعت میں کوئی خرابی پیدا کر دی بلکہ اور اچھا اثر کیا۔ آپؐ کے حالات میں بہت

عمدہ باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً جب آپؐ کی صاحبزادی کا انتقال ہوا تو آپؐ نے اپنے طرز میں جو کچھ فرمایا وہ صداقت سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ عیسوی عقائد سے ملتا جلتا ہے۔ یعنی اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ (ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں) یہی آپؐ نے اس وقت بھی فرمایا جب آپؐ نے آزاد کردہ محبوب غلام زیدؓ کی وفات کی خبر سنی۔ زید دوسرے مسلمان تھے۔ یہ غزوۂ تبوک میں شہید ہوئے جو یونانیوں[1] سے آنحضرتؐ کی پہلی جنگ تھی۔ ان کی شہادت کا حال سن کر آپؐ نے فرمایا: "اچھا ہوا کہ زیدؓ راہِ خدا میں کام آئے۔ وہ اب اپنے مالک سے جا ملے اور ان کا انجام بخیر ہوا۔" لیکن اس کے باوجود حضرت زیدؓ کی صاحبزادی نے آپؐ کو ان کی نعش پر روتے دیکھا اور عرض کیا: "یارسول اللہ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟" آپ نے ارشاد فرمایا: "ایک انسان کو اپنے دوست کی جدائی پر روتا دیکھ رہی ہو۔"

وفات کے دو روز قبل آپؐ آخری مرتبہ مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا کہ "اگر میں نے کسی کو اذیت پہنچائی ہے تو وہ مجھ سے آج بدلہ لے لے۔

---

[1] مسلمانوں کی یہ جنگ رومیوں کے مقابلے میں تھی نہ کہ یونانیوں کے۔ حضرت زیدؓ کی شہادت جنگ موتہ میں واقع ہوئی تھی نہ کہ غزوۂ تبوک میں۔

اگر میں کسی کا مقروض ہوں تو وہ اپنا قرضہ مانگ لے"۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ "ہاں! آپ کو میرے تین درہم دینے ہیں جو فلاں تاریخ پر قرض لئے تھے"۔ آپؐ نے ان کے درہم ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ "آج کی شرمساری روز محشر کی رسوائی سے بہتر ہے"۔

وہ واقعہ بھی آپ لوگوں کو یاد ہوگا جب حضرت عائشہؓ کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا تھا کہ "قسم ہے رب العالمین کی، میں خدیجہؓ کو تم سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں"۔ اس قسم کے واقعات آج بارہ صدی کے بعد بھی مادر فطرت کے اُس سچے فرزند کی صداقت کا پتہ دیتے ہیں جس کے بنی نوع ہونے کا شرف ہم سب کو حاصل ہے۔

مجھے محمدؐ کا تصنع اور ظاہر داری سے کوسوں دور رہنا بہت پسند ہے۔ مادرِ صحرا کا وہ ناتربیت یافتہ فرزند اپنے بل بوتے پر کام کرتا ہے اور اپنی ذات کے متعلق کوئی غلط ادعا نہیں کرتا۔ اس میں نہ تو غرور و خود نمائی ہے نہ خوشامد و عاجزی۔ وہ اپنی اصلی حالت میں پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنی عبا پر خود پیوند لگاتا اور اپنی نعلین کی خود مرمت کرتا ہے، دوسری طرف نہایت بے تکلفی سے ایران کے بادشاہوں اور یونان کے شہنشاہوں کو ان کے فرائض پر توجہ دلاتا ہے۔ غرض وہ اپنے درجے اور عزت کا پوری طرح علم رکھتا ہے۔ بدوں کے ساتھ خوں ریز

معرکہ آرائیوں میں ظلم وستم کے بغیر چارہ نہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں رحم وکرم کی بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ آنحضرتؐ نہ جنگ وجدل سے احتراز کرتے ہیں اور نہ رحم وکرم پر افتخار۔ وہ دونوں آپؐ کے دل کی اصلی صدائیں تھیں جو ارتجالاً[1] بلند ہوگئیں۔ آپؐ نے ہمیشہ شیریں زبانی ہی سے کام نہیں لیا بلکہ وقتِ ضرورت زور اور سختی بھی کی ہے۔ آپؐ میں لگی لپٹی رکھنے کی عادت نہ تھی۔ غزوۂ تبوک کا آپؐ بار بار ذکر کرتے ہیں۔ اس موقع پر آپؐ کے ساتھیوں میں سے اکثر نے چلنے سے انکار کر دیا تھا اور گرمی کی شدت اور فصل کے خراب ہو جانے کا عذر کیا تھا۔ آپؐ اس واقعے کو کبھی نہیں بھول سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "تمہاری کھیتیاں کتنے دن کام آئیں گی؟ ابد تک ان کا کیا حشر ہوگا؟ گرمی کی شدت تو بے شک تھی مگر دوزخ اس سے زیادہ گرم ہوگی"۔ بعض دفعہ آپؐ نے طنز سے بھی کام لیا ہے۔ چنانچہ کفار سے فرماتے ہیں کہ "قیامت کے دن تمہیں اپنے اعمال کا پورا پھل ملے گا۔ تمہارے اعمال تولے جائیں گے اور ان میں کسی طرح کی کمی نہ کی جائے گی"۔ ہر بات کا تصور آپؐ اپنے ذہن میں قائم کر لیتے بلکہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے جس کی عظمت کے احساس سے بعض دفعہ

---

[1] از خود

آپ پر سکتے کا عالم طاری ہو جاتا۔ آپ اکثر "بے شک" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن میں بعض دفعہ یہ لفظ ایک مستقل جملے کی طرح استعمال ہوا ہے۔

آنحضرتؐ کے نزدیک زندگی ہنسی کھیل نہیں تھی۔ وہ نجات اور گمراہی کا معاملہ تھا۔ ازل اور ابد کا سوال تھا۔ آپؐ اس بارے میں غضب کے سنجیدہ تھے۔ زندگی کو ایک کھیل سمجھنا، وہم و قیاس کو دخل دینا، تلاشِ حق میں بے اعتنائی سے کام لینا اور صداقت کے ساتھ تمسخر و استہزا کرنا بدترین گناہ ہے۔ تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ یہ جذبہ ایسے انسان کے دل و دماغ پر حاوی ہوتا ہے جسے صداقت کی ہوا تک نہ لگی ہو۔ جو محض نمود و نمائش کے عالم میں رہتا ہو۔ ایسا انسان نہ صرف جھوٹ تراشتا اور جھوٹ بولتا ہے بلکہ خود کذب مجسم ہے۔ اعلیٰ اصول اخلاق کا شعلۂ ایزدی اُس کے سینے میں سرد پڑ گیا ہے۔ خاکستر ہو گیا ہے۔ محمدؐ کا کذب و افترا بھی ایسے شخص کے صدق و صفا سے بہتر ہے۔ وہ ریاکار انسان ہے گو بظاہر نہایت معقول، مہذب، خوش خلق، شیریں کلام اور زہریلے سانپ کی طرح خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔

ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ محمدؐ کے اخلاقی اصول ہمیشہ بہترین ہوا کرتے ہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کا میلان ہمیشہ خیر کی طرف

ہوتا ہے ۔ وہ ایک ایسے قلب کے سچے احساسات ہیں جس کا مطمحِ نظر صداقت و معدلت رہتا ہے ۔ مثلاً گو اسلام میں مسیحیت کا یہ اعلیٰ اصولِ عفو نہیں پایا جاتا کہ " اگر کوئی شخص ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے آگے کر دیا جائے " بلکہ اسلام میں بدلہ لینے کا حکم ہے لیکن ساتھ ہی شرط یہ ہے کہ حد انصاف سے نہ بڑھنا چاہیئے ۔ اسی طرح اسلام کامل مساوات کا علمبردار ہے جیسا کہ ایک اعلیٰ مذہب اور نباضِ فطرت انسانی کو ہونا چاہیئے ۔ اس میں ایک مسلمان کی جان دنیا کے تمام تاج و تخت پر بھاری ہے ۔ نیز اس کی رو سے سب بنی آدم یکساں ہیں ۔ خیرات دینا اسلام میں صرف جائز نہیں بلکہ لازم ہے ۔ اس میں زکوٰۃ کا نصاب بھی معین کر دیا گیا ہے اور اگر کوئی شخص نہ ادا کرے تو وہ اس کا جواب دہ ہو گا ۔ ہر شخص کی سالانہ آمدنی کا دسواں[۱] حصّہ (خواہ وہ کتنا ہی ہو) غریبوں، معذوروں اور محتاجوں کا حق ہے ۔ غرض یہ تمام اصول نہایت عمدہ ہیں ۔ یہ رحم و انصاف اور محبت و انسانیت

---

[۱] زرعی پیداوار جو برساتی پانی سے حاصل ہو اس پر زکوٰۃ دسواں حصّہ ہے ۔ جو پیداوار مصنوعی ذرائع سے پانی پہنچا کر حاصل کی جائے اس پر زکوٰۃ بیسواں حصّہ اور تجارتی آمدنی پر چالیسواں حصّہ ۔

کے وہ مطالبات ہیں جن کی صدائے بازگشت مادرِ فطرت کے اس
امّی فرزند کی ذات سے بلند ہوئی۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام میں بہشت و دوزخ کا جو تصور پیش کیا گیا وہ
بڑی حد تک حیوانی ہے جس سے ہمارے روحانی احساسات سخت مجروح
ہوتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ عربوں میں یہ تصور پہلے ہی سے موجود
تھا۔ آنحضرتؐ نے اس میں ایسی تبدیلیاں کیں جن سے وہ معقول و
معتدل ہو گیا۔ علاوہ ازیں بہشت و دوزخ کے بدترین لذائذ و
مصائب حیوانی آنحضرتؐ کے پیدا کردہ نہیں بلکہ بعض علمائے امت
کے ہیں۔ قرآن میں بہشت کی نعمتوں کا بہت ہی مختصر تذکرہ ہے۔
ان کا ذکر اجمالاً آیا ہے نہ تفصیلاً۔ اس میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا
ہے کہ جنت کی اعلیٰ ترین نعمت روحانی ہوگی یعنی خدا کا دیدار جو باقی
تمام نعمتوں سے بدرجہا افضل ہوگا۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ
تمہیں سلامتی نصیب ہوگی۔ "سلامتی" یہی وہ شے ہے جس کا ہر
سمجھدار آدمی آرزومند رہتا ہے اور جسے وہ عظیم ترین نعمت سمجھ کر
اس دنیا میں حاصل کرنے کے لئے سرگرداں ہے۔ اس کے بعد
فرماتے ہیں: "تم وہاں نشست گاہوں پر ایک دوسرے کے مقابل
بیٹھو گے اور تمام بغض و حسد تمہارے سینوں سے دھو دیا جائے گا۔

تم آپس میں دل کھول کر محبت کرو گے۔ تم میں سے ہر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جگہ پائے گا اور جنت کا لطف اٹھائے گا۔"

بہشت کی حیوانی لذتوں کے سلسلے میں بہت سی باتیں قابل ذکر تھیں۔ لیکن ان کو یہاں بیان کرنا دقت سے خالی نہیں۔ اس لئے میں صرف دو اُمور کا تذکرہ کر کے ان کا فیصلہ آپ پر چھوڑ دوں گا۔ ان میں سے پہلی بات کی طرف میرا ذہن گوئیٹے کے ایک سرسری اشارے کی وجہ سے منتقل ہوا جو بہت قابلِ لحاظ معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی کتاب "سفرنامۂ میتر" میں بیان کرتا ہے کہ اس کا ہیرو ایک ایسی انجمن میں پہنچا جس کے اصول عجیب و غریب تھے۔ مثلاً یہ کہ تمام اراکین سے صدر انجمن نے کہا: "ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی کسی ایک خواہش پر قدرت حاصل کرے۔ یعنی کسی ایک بات میں اپنی خواہش کے بالکل برعکس عمل کرے، اور اُسی کام کے کرنے پر کمر باندھے جس سے اس کی طبیعت گریز کرتی ہے۔ اس کے معاوضے میں ہم اسے دوسری خواہشات کی تکمیل زیادہ وسعت اور آزادی کے ساتھ کرنے کی اجازت دیں گے۔"

مجھے یہ اصول بہت پسند آیا۔ اچھی چیزوں سے لطف اندوز ہونے میں کوئی برائی نہیں۔ برائی اس میں ہے کہ اپنے نفس کو اُن کا غلام بنا لیا جائے۔ انسان اس کا اطمینان کرلے کہ وہ اپنی عادتوں پر قابو رکھتا ہے اور اگر

کوئی معقول وجہ بتائی جائے تو ان کو ترک کر سکتا ہے۔ یہ میرے نزدیک بہترین اصول ہے ...... رمضان کا مہینہ (جسے اسلام اور خود آنحضرتؐ کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے) اسی اصول کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اگر اس سے آنحضرتؐ کا مطلب صاف و صریح طور پر تہذیبِ اخلاق نہ تھا تو بھی کوئی اعلیٰ اور مفید مقصد ضرور تھا جو اسی طرح قابلِ تعریف ہے۔

بہشت و دوزخ کے اسلامی تصور کی نسبت ایک اور امر قابل اظہار یہ ہے کہ وہ کیسا ہی بھدا اور مادی سہی، لیکن حقیقتِ جاوید کی ایک ایسی تصویر ہے جس کی مثال کسی اور جگہ نہیں ملتی۔ وہ عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی جنت، وہ شعلہ ہائے آتشیں سے دہکتی ہوئی دوزخ اور وہ جانگداز روزِ محشر جس کا آنحضرتؐ نے بار بار ذکر کیا، یہ سب کیا ہے؟ ایک ناتراشیدہ اعرابی تخیل میں اس عظیم روحانی حقیقت کا موہوم سا پرتو ہے جسے تمام حقائق کی ابتدا کہنا چاہیئے اور جس کے علم و احساس سے محروم رہنا ہم سب کے حق میں زبوں ہوگا، یعنی اعمال کے دائمی اثرات۔ اس دنیا میں انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اس کے لئے بے انتہا اہم ہے، جس کے اثرات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ وہ اپنی مختصر سی زندگی میں جنت کی بلندیوں تک بھی پہنچ سکتا ہے اور جہنم کی سی پستیوں تک

بھی - اور اس ساٹھ سال کی قلیل مدت میں عمر جاوید پنہاں رکھتا ہے۔

یہ تمام امور اس ناتراشیدہ عربی روح پر حروف آتشیں سے کندہ تھے، شعلہ و برق سے لکھے گئے، جو ہر وقت آپ کے پیشِ نظر رہتے - انتہائی صداقت و خلوص کے ساتھ وہ انہیں ادا کرنا چاہتے اور نہ ادا کر سکتے - وہ انہیں الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں - بہشت و دوزخ کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں - یہ حقیقت خواہ کسی رنگ میں پیش کی جائے تمام حقائق کی ابتدا ہے - ہر لباس میں قابل احترام ہے - "انسان کا اصل مقصد اس دنیا میں کیا ہے؟" محمدؐ نے اس سوال کا ایسا جواب دیا جو بعض مسیحی علما کو بھی شرما دیتا ہے - بنتھم[1] اور پیالے[2] کی طرح وہ گناہ و ثواب کو لے کر سود و زیاں کا حساب نہیں لگاتے - کفر و

---

[1] جریمی بنتھم (۱۷۴۸ء - ۱۸۳۲ء) انگلستان کا مشہور افادی مصلح - اس نے ۱۷۶۷ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے پریکٹس شروع کی لیکن اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوا اور تالیف و تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا - فزیکل سائنس، سیاسیات، اصول قانون اور اخلاقیات کی مختلف شاخوں پر اس نے بیش بہا تصانیف چھوڑی ہیں -

[2] ولیم پیالے (۱۷۴۳ء - ۱۸۰۵ء) انگلستان کا ممتاز فاضل دینیات و فلسفہ اور لیکچرر کرائسٹ کالج کیمبرج - مصنف "مذہب فطرت"، "اصول اخلاق" وغیرہ -

ایمان پر جمع و تفریق کا عمل کر کے حاصل نہیں دکھلاتے کیونکہ ان دونوں میں صرف اچھے اور بُرے کا فرق نہیں بلکہ موت و حیات، بہشت و دوزخ کا فرق ہے۔ اول الذکر کسی صورت میں نہ کیا جائے۔ آخر الذکر کسی حالت میں نہ چھوڑا جائے۔ تم انہیں ناپ نہیں سکتے کیونکہ ان کے لئے کوئی مشترک پیمانہ نہیں۔ ایک، انسان کے حق میں دوامی موت ہے اور دوسری، ابدی حیات۔ بنتھم کا نظریۂ افادیت! یعنی نفع و نقصان کو نیکی کا معیار قرار دینا۔ بالفاظ دیگر خدا کی اس کائنات کو آلۂ بے جان بنا دینا انسان کی اتھاہ اور علوی روح کو خس و خاشاک اور شادی و غم کا پیمانہ کر دینا ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ انسان اور اُس کے انجام کا غلط تر اور فروتر نظریہ کون پیش کرتا ہے۔ محمدؐ یا یہ لوگ؟ تو میں کہوں گا کہ یہ لوگ۔

میں پھر یہی کہوں گا کہ بحیثیت مجموعی اسلام ایک طرح کی عیسائیت ہے۔ اس میں عیسائیت کی اعلیٰ ترین روحانیت کے وہ تمام عناصر موجود ہیں جنھیں اس کی کمزوریاں نہیں چھپا سکتیں اسکینڈی نیویا کا "خدائے آرزو" جو تمام غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا خدا ہے اس کو

لہ گریم نام ایک جرمن ماہر علم۔ ف لی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ قدیم باشندگان اسکینڈی نیویا

(باقی اگلے صفحہ پر)

آنحضرتؐ نے "جنت" کی صورت میں وسعت دے دی۔ ایسی جنت جو طاعت و زہد کی نشانی ہے اور ایمان و اعمال صالح کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔ وہاں پہنچنے کے لئے حسن عمل کے ساتھ صبر جمیل بھی چاہیئے جو اس سے زیادہ مشکل چیز ہے۔ اسکینڈے نیویا کے قبل عیسوی مذاہب پر آنحضرتؐ نے ایک سچے روحانی عنصر کا اضافہ کر دیا۔ اُسے جھوٹا نہ کہیئے۔ اس کی غلطیوں پر نظر نہ ڈالیئے بلکہ اس کی صداقت کو دیکھیئے۔ آج بارہ سو برس سے یہ ساری نوع انسان کی پنجم آبادی کا مذہب اور مقصد زندگی بنا ہوا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگوں نے اس مذہب کو صدق دل سے یقین کیا ہے۔ عرب اپنے مذہب پر پختہ اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کے پابند رہنا چاہتے ہیں۔ ازمنہ اولیٰ کے بعد سے آج تک عیسائیوں کا کوئی فرقہ (بجز موجودہ انگریز پیورٹنز کے) اپنے مذہب کا ایسا پابند نہیں رہا جیسے مسلمان۔ وہ اس پر کامل یقین رکھتے ہیں اور اسی پر اپنی دنیا و آخرت کا دارومدار سمجھتے ہیں۔ آج رات کو قاہرہ کی سڑکوں پر جب پاسبان "کون جا رہا ہے"؟ کا نعرہ لگائیں گے تو جواب میں

(بقیہ صفحہ ۸۴)
کے اور معبودوں کے منجملہ ایک "وینس" تھا جس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ انسانی آرزوں کا پورا کرنا اسی سے متعلق ہے۔

رہرو کے نام ونشان کے ساتھ یہ آواز بھی آئے گی کہ لا الہ الا اللہ۔ "اللہ اکبر" اور "اسلام" کے الفاظ ان کروڑوں بندگانِ خدا کے رگ وپے میں سرایت کر گئے ہیں اور ان کی روزانہ زندگی کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ پُرجوش مبلغین ہر قوم وملّت میں اُس کی اشاعت کرتے پھرتے ہیں اور ان مذاہب پر غالب آجاتے ہیں جو درجے میں اس سے بہتر نہیں ہوتے۔

عربوں کے حق میں اسلام گویا ظلمت میں نور کا ظہور تھا جس کے اثر سے ملک عرب پہلے پہل بیدار ہوا۔ ایک غریب گلہ بان قوم جو ابتدائے آفرینش سے ریگزاروں میں گمنام پڑی پھر رہی تھی، اُس کی ہدایت کے لئے ایک ہیرو پیغمبر کے لباس میں ایسا پیام دے کر بھیجا گیا جس پر وہ ایمان لا سکی۔ دیکھو! اب وہ گمنام چرواہے دنیا میں مشہور ہو جاتے ہیں اور وہ حقیر شتربان سارے عالم پر چھا جاتے ہیں۔ ایک صدی کے اندر عرب کا سکّہ دہلی سے غرناطہ تک جاری ہو گیا اور اس کی شجاعت وذہانت کا آفتاب مدت تک ایک عالم پر ضوفشانی کرتا رہا۔ ایمان ایک عظیم اور جان بخش نعمت ہے۔ جہاں کوئی قوم ایمان لائی، اور اس کی تاریخ عظمت ورفعت کی داستانوں سے معمور ہوئی۔ عربوں کی قوم، آنحضرتؐ کی ذات اور ایک صدی کی مدت! بس یہ معلوم ہوتا ہے گویا ایک چھوٹی سی چنگاری

ایسے تودۂ عظیم پر گری جو بظاہر محض انبار خاکستر تھا، مگر دیکھنا! وہ انبار آتش گیر مادہ ثابت ہوا جس کے شعلے دہلی سے غرناطہ تک بلند ہوئے اور آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بڑا انسان ایک برق آسمانی ہوتا ہے اور باقی سب لوگ تودۂ ہیزم کی طرح اس کے منتظر رہتے ہیں جنھیں وہ آن واحد میں شعلۂ روشن بنا دیتا ہے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

لاہور - راولپنڈی - ملتان - کراچی - سکھر - پشاور - کوئٹہ